ناول نمبر 64
ڈریکولا
کا
بھوت
FB PAGE = ISHTIAQ AHMED NOVELS

دو باتیں

السلام علیکم!

''بھیانک سازش'' کے بعد ''ڈریکولا کا بھوت'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بھوت کو ہاتھوں میں لینا بڑے دل گردے کا کام ہے، لیکن میں جانتا ہوں، آپ بھی دل گردے والے ہیں، اگر دل گردے والے نہ ہوتے تو اس رفتار سے میرے ناول نہ پڑھتے، ایک دل والے نے تو یہ تک فرمائش کر ڈالی کہ میں ہر روز ایک ناول لکھا کروں۔ یہ ناول گردے کی بات۔

آپ ''ڈریکولا کے بھوت'' سے فارغ ہوں گے تو ''پستول کا اغوا'' آپ کی خاطر تواضع کے لیے موجود ہوگا.... اور جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ کس کے پستول کا معاملہ تھا تو آپ کی حیرت کا ٹھکانا نہیں رہے گا، آپ کی حیرت کے لیے میں کوئی ٹھکانا مہیا کر بھی تو نہیں سکتا، مجبور ہوں۔ معاف کر دیجیے گا۔

اشتیاق

خون کہاں گیا

ڈاکٹر رحمان انصاری کے کلینک میں ایک شخص ایک بچے کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے اندر داخل ہوا اور دوسرے مریضوں کی پروا کیے بغیر ڈاکٹر تک جا پہنچا:

''ڈاکٹر صاحب! پہلے اسے دیکھیے۔''

''میں مریضوں کو باری کے مطابق دیکھتا ہوں، آپ سے پہلے بھی بہت سے مریض یہاں موجود ہیں، تشریف رکھیے اور اپنی باری کا انتظار کیجیے۔'' ڈاکٹر رحمان انصاری نے اس آدمی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ اس وقت ایک بوڑھے آدمی کا معائنہ کر رہا تھا جو دمے کا مریض تھا۔ اس کے ہاں ہمیشہ مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ شہر کا مشہور ڈاکٹر تھا، لیکن بہت مہنگا تھا۔ غریب آدمی اس سے علاج کرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

''لیکن یہ مر رہا ہے ڈاکٹر ذرا اسے دیکھیے، اس کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔ اُف میرا بچہ۔'' اس آدمی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اب ڈاکٹر نے نظر اُٹھا کر بچے کو دیکھا اور پھر چونک اُٹھا۔ اس کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا، جیسے سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی ہو۔

''اسے کیا ہوا؟'' ڈاکٹر انصاری بوڑھے کو چھوڑ کر اس کی طرف مُڑا۔

''خدا جانے اسے کیا ہوا، کس کی نظر کھا گئی، دو دن پہلے تو بالکل ٹھیک تھا۔ بھاگتا دوڑتا کودتا پھرتا تھا۔'' باپ نے کہا۔

''اسے لٹا دیں، میں دیکھتا ہوں۔''

باپ نے بچے کو مریضوں کے لیے بچھائے گئے گدے دار بنچ پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر انصاری اس پر جھک گیا۔ چند منٹ تک وہ مختلف طریقوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا، پھر سیدھا ہوتا ہوا بولا:

''اس کے جسم میں تو خون بالکل نہیں ہے؟''

''لیکن دو دن پہلے تو یہ بالکل ٹھیک تھا، اسے کوئی چوٹ بھی تو نہیں لگی۔''

''اوہ! تو پھر خون کہاں گیا۔'' ڈاکٹر انصاری کے منہ سے نکلا۔

''جج جی.... میں کیا بتا سکتا ہوں۔''

''کل اس کی کیا حالت تھی؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''کل صبح یہ سو کر اُٹھا تو اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، ہم دیکھ کر حیران رہ گئے، محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے طاقت کی دوائیں لکھ دیں اور بتایا کہ بچے کو کوئی بیماری نہیں ہے، بس خون کی کمی ہے، ہم بہت حیران ہوئے کہ یکا یک خون کیسے کم ہو گیا۔ خیر دوائیں شروع کر دیں۔ آج یہ اٹھا تو رنگ بالکل ہی زرد تھا۔ ہم بُری طرح گھبرا گئے اور میں بچے کو آپ کے پاس لے آیا۔'' وہ بتاتا چلا گیا۔

ڈاکٹر انصاری چند لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی پیشانی پر فکر کی لکیریں اُبھر آئیں۔ آخر اس نے کہا:

''عجیب بات ہے، اس طرح یکا یک خون کا غائب ہونا کچھ سمجھ میں نہیں

آتا، بہر حال سب سے پہلے میری فیس جمع کرا دیں، اس کے بعد میں اس کا تفصیل سے معائنہ کروں گا، خون کا نمبر معلوم کروں گا اور اگر اس نمبر کا خون مل سکا تو بچے کو دیا جائے گا، مجھے اُمید ہے کہ بچہ خون ملتے ہی تندرست ہو جائے گا۔''

''بہت بہتر! آپ کی فیس کتنی ہے۔''

''دو سو روپے، باقی خرچ کی تفصیل بعد میں بتائی جائے گی۔''

''بہت بہتر!'' یہ کہہ کر باپ بچے کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ وہاں ڈاکٹر کا کلرک بیٹھا تھا، اس نے بچے کا نام پتا لکھا اور دو سو روپے وصول کر کے ایک چٹ اسے تھما دی۔ یہ چٹ اس نے اندر لے جا کر ڈاکٹر کو دی جواب پھر دے کے مریض اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے فارغ ہو کر وہ پھر بچے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

''آپ کا نام غلام جیلانی ہے۔''

''جی ہاں!'' باپ نے کہا۔

''آپ تو شہر کے بہت مشہور آدمی ہیں، اخبارات میں عام طور پر آپ کا نام شائع ہوتا رہتا ہے۔''

''جی ہاں! میں شہر میں اُون کا سب سے بڑا تاجر ہوں۔''

''اور بچے کا نام کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''طاہر جیلانی۔'' غلام جیلانی نے کہا۔

''ہوں! اب میں اس کا معائنہ کرنے لگا ہوں، آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیے۔''

''جی، وہ کیوں؟'' غلام جیلانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہم بچے کا خون لیں گے، ریڑھ کی ہڈی میں سے چند قطرے لیں گے اور یہ کافی تکلیف دہ طریقہ ہے، آپ باپ ہیں، آپ یہاں موجود رہیں گے تو آپ کو بھی تکلیف ہو گی۔''

''اوہ! اچھا میں باہر والے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔''

غلام جیلانی نے کہا اور اس کمرے میں آکر بیٹھ گیا جس میں مریض بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، بچے کے لیے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ شہر کا سب سے بڑا تاجر، کروڑوں روپے میں کھیلنے والا لیکن بچہ صرف ایک ہی تھا، اب اگر وہ بھی جل بستا تو اس کے لیے دنیا میں کیا رہ جاتا۔

ایک ایک منٹ ایک ایک سال بن کر گزرا، آخر پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے دروازے میں سے سر باہر نکال کر کہا:

''غلام جیلانی صاحب، اندر تشریف لے آئیں۔''

وہ اُٹھ کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس کا رنگ سفید ہو رہا، آنکھوں میں خوف تھا، ہاتھ اور پیروں میں کپکپی تھی:

''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے۔''

''جو کچھ میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ اس قدر بھیانک اور لرزہ خیز ہے کہ میں بتانے کی ہمت نہیں پا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر انصاری نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

''یا اللہ رحم! آخر بات کیا ہے۔'' غلام جیلانی کے منہ سے ڈرے ڈرے لہجے میں نکلا۔

''بات تو میں بعد میں بتاؤں گا، پہلا مسئلہ تو بچے کو خون دینے کا ہے، اگر

اسے چند منٹ کے اندر اندر خون نہ دیا گیا تو یہ چل بسے گا، اس کے خون کا نمبر او ہے، اس وقت میرے پاس او نمبر کا خون نہیں ہے، یہاں ایک خون کا پرائیوٹ بنک ہے، اگر آپ کہیں تو میں خون پر ان سے بات کروں، وہ فوراً خون یہاں پہنچا دیں گے۔''

''ضرور کریں، اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔'' غلام جیلانی نے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کے سامنے کوئی نمبر گھمایا اور او نمبر خون کے بارے میں بات کی پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر غلام جیلانی سے بولا:

''دس ہزار روپے ایک بوتل کے مانگتے ہیں اور آپ کے بیٹے کو کم از کم پانچ بوتل خون کی ضرورت ہے۔''

''جلدی کیجیے۔ میں دس لاکھ روپے کا خون بھی خریدنے کے لیے تیار ہوں۔''

''بہت بہتر!'' یہ کہہ کر اس نے خون کے لیے ہدایت دی اور ریسیور رکھ دیا گیا۔ اس کا اسسٹنٹ خون جسم میں داخل کرنے کے لیے سٹینڈ وغیرہ لگانے لگا۔ ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ خون کی پانچ بوتلیں اُٹھائے دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ غلام جیلانی نے انہیں اس وقت پچاس ہزار روپے کا چیک کاٹ دیا۔ وہ چیک لے کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خون قطرہ قطرہ کر کے طاہر جیلانی کے جسم میں داخل ہونے لگا، ڈاکٹر انصاری نے اب دوسرے مریضوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس طرح دو گھنٹے گزر گئے طاہر کے منہ کی رونق واپس آنے لگی، اس کا سانس پرسکون ہونے لگا۔ باپ کی بے قراری دُور ہونے لگی، کلینک سے باہر اس کے گھر کے دوسرے افراد بھی بے چین تھے۔ اس نے انہیں جا کر بتایا کہ

نہیں کر سکتا۔'' غلام جیلانی بولا۔

''اس سلسلے میں جتنی بھی کتابیں میرے پاس ہیں، میں آج رات سونے سے پہلے ان کا مطالعہ کروں گا اور غور کروں گا خدا جانے کیا چکر ہے۔ دیکھیے نا.... آخر بچے کا خون اس طرح یکا یک کہاں چلا گیا، جب کہ اس کے جسم پر کوئی چوٹ نہیں لگی، خون نہیں بہا جسم سے خون اسی وقت نکلتا ہے جب اس کے چوٹ لگے، کٹ جائے ورنہ خون نہیں نکل سکتا۔'' ڈاکٹر بولا۔

''اب میں کیا کروں، سوال تو یہ ہے۔'' غلام جیلانی نے کہا۔

''رات کے وقت اپنے گھر کے تمام دروازے بند کرا کے سوئیے، کھڑکیوں میں اگر لوہے کی سلاخیں نہیں ہیں تو فوراً سلاخیں لگوا لیں، کیونکہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ڈریکولا قسم کے لوگوں میں طاقت بہت ہوتی ہے، گولی انہیں زخمی تو کر سکتی ہے، لیکن ختم نہیں کر سکتی، جس کا یہ خون پی لیتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے تو وہ بھی انہی کی طرح ڈریکولا بن کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کا خون چوسنے لگتا ہے۔ اس طرح اور لوگوں کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔''

''آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں ڈاکٹر صاحب، مجھے چل کر فوراً دروازوں اور کھڑکیوں کا بندوبست کرنا چاہیئے۔''

''ہاں اور رات کو بہت دیر تک جاگتے رہیں، اس بچے کے پاس موجود رہیں، مکان کی بتیاں نہ بجھائیں بلکہ کچھ اور بلب لگا لیں، ایسے لوگ روشنی سے گھبراتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اسے ہدایت دی۔

''بہت اچھا! میں چلتا ہوں۔''

غلام جیلانی گھر پہنچا تو اندر کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی

۔ وہ فوراً ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

''ارے خان رحمان تم!''

''ہاں میں! بھائی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ میں فوراً چلا آیا۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔'' خان رحمان جلدی جلدی بولے، وہ اس کے دوست تھے۔

غلام جیلانی نے انہیں وہ سب باتیں بتا دیں جو ڈاکٹر نے بتائی تھیں۔ خان رحمان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے، کافی دیر بعد انہوں نے سر اوپر اٹھایا اور بولے:

''ان حالات میں کوئی ڈاکٹر ہماری شاید ہی مدد کر سکے۔ صرف ایک شخص ایسا ہے، جو اس مسئلے کا حل تلاش کر سکتا ہے۔''

''لیکن اب تو طاہر ٹھیک ہو چکا ہے، اب ہمیں کسی کی مدد کی کیا ضرورت!'' غلام جیلانی نے حیران ہو کر کہا۔

''یہ سوچنا غلط ہے۔ صرف اپنے بچے کے بارے میں نہ سوچو، اگر شہر میں واقعی کوئی ڈریکولا قسم کا آدمی موجود ہے تو وہ اور لوگوں کے لیے بھی تو خطرہ ہے، میرا اشارہ اس طرف تھا، لہٰذا مجھے اس شخص کو فون کر کے یہاں بلانا ہی ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔

''اور وہ کون ہے۔''

''اس کا نام انسپکٹر جمشید ہے۔''

خان رحمان نے کہا اور فون پر جھک گئے۔

☆☆☆

خون کا پیغام

تینوں اپنی تجربہ گاہ میں تھے۔ فارغ ہوتے تو یہاں آکر بیٹھ جاتے تھے اور اِدھر اُدھر کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اسی شغل میں مصروف تھے:

''ہمیں یہ کام بغیر کسی وجہ کے نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم لوگوں کی باتیں سن لیتے ہیں۔'' محمود کہہ رہا تھا۔

''لیکن ہم ان کے چہرے تو نہیں دیکھتے، ہمیں کیا معلوم، کہنے والا اور سننے والا کون ہے۔'' فرزانہ نے جواب دیا۔

''ہم تو دن رات ایسے ہی کام کرتے رہتے ہیں، اس طرح تو ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینے چاہیے۔ بے چاری تعلیم بھی ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہوگی کہ ہم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جب کہ دوسرے طالب علم دن رات کتابوں سے چمٹے رہتے ہیں۔'' فاروق نے مسکرا کر کہا۔

''فکر نہ کرو، تعلیم ہم سے بہت خوش ہے، جو طالب علم دن رات کتابیں پڑھتے ہیں، ہم ہر سال ان سے زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں پھر بھلا تعلیم کیوں کچھ سوچے گی، ویسے بھی سوچ بچار کرنا جان داروں کا کام ہے، نہ کہ بے جان

چیزوں کا۔'' فرزانہ نے جل کر کہا۔

''ہائیں! تو کیا تعلیم بے جان ہے، پھر اسے حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''اس کا مطلب ہے، تم صرف جان دار چیزیں حاصل کرتے رہتے ہو۔'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں! میں ذرا شکاری قسم کا آدمی ہوں۔'' فاروق نے مسکرا کر کہا۔

''شکاری قسم کے ہو، شکاری تو نہیں ہوتا اور پھر شکاری تو پرندوں اور جانوروں کو مارتے ہیں، زندہ کب پکڑتے ہیں فرزانہ نے کہا۔

''بہادر شکاری اپنے شکار کو زندہ پکڑتا ہے اور اس کے بعد حلال کرتا ہے، ایک بار میری ملاقات ایک شیر سے ہوگئی تھی۔ کہنے لگا.... '' فاروق کہہ رہا تھا کہ محمود نے اسے ٹوک دیا۔

''ٹھہرو! پہلے اتنا بتادو کہ یہ کب کی بات ہے۔''

''عجیب احمق ہو، یہ میں ڈائری دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں اور ڈائری اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔''

''وہ کس کے پاس ہے۔'' فرزانہ شوخ انداز میں مسکرائی۔

''کانے دیو کے پاس، اس کے دو بڑے بڑے نوکیلے دانت ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ڈائری اس نے اپنے پاس بھی نہیں رکھی، شاید اسے خطرہ تھا کہ میں اس سے حاصل کرنے کے لیے اس کے سر پر پہنچ جاؤں گا، اگرچہ اس کا سر بہت چکنا ہے اور پھسلنے کا خطرہ ہے، پھر بھی میں یہ خطرہ ضرور مول لیتا، تم جانتے ہی ہو، ہم خطرات مول لینے میں کس قدر تیز ہیں، ہاں تو میں کہہ رہا تھا، دیو نے ڈائری اپنے پاس رکھنے کی بجائے نیلے طوطے کی چونچ میں دے رکھی

ہے، اور اس نیلے طوطے تک پہنچنا اور اسے ہلاک کرنا بہت مشکل ہے۔''

''کیوں! ابھی تو تم شیر کے شکار کی بات کر رہے تھے، اور طوطے کا شکار کر نہیں سکتے۔''

''اس لیے کہ وہ طوطا، عام طوطا نہیں ہے، اسے مارنا اسی لیے بہت مشکل ہے کہ اس کی جان اس کانے دیو میں ہے۔'' فاروق کہتا چلا گیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ آج تک تو جنوں اور دیووں کی کہانیوں میں یہ پڑھا ہے کہ جنوں اور دیوؤں کی جان کسی جانور یا پرندے میں ہوتی ہے اور تم اُلٹ بات کہہ رہے ہو۔'' محمود نے کہا۔

''ثابت ہوا، تم جنوں، دیووں اور بھوتوں کی کہانیاں پڑھتے ہو، لاحول ولاقوۃ، کیسا شوق ہے تمہارا۔'' فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

''غلط سمجھے! میں نے ایسی کہانیاں کبھی نہیں پڑھیں، لیکن جب ہم بہت چھوٹے تھے اور دادی جان زندہ تھیں، تو اس وقت وہ رات کو سونے سے پہلے ایسی کہانیاں ضرور سنایا کرتی تھیں۔'' محمود نے کہا۔

''ارے ہاں! یاد آیا۔ دادی اماں کتنی اچھی تھیں۔'' فاروق نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''لو! ڈاڑی سے دادی اماں تک پہنچ گئے۔'' فرزانہ جھلا اُٹھی۔

''ڈاڑی سے نہیں، شیر کے شکار سے دادی اماں تک۔'' فاروق مسکرایا۔ ''میں نے بات شیر کے شکار کی شروع کی تھی، درمیان میں ڈاڑی ٹپک پڑی۔''

''ٹپکی کہاں بے چاری! وہ تو طوطے کے منہ میں ہے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''بہت دیر سے تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں جاری ہیں، شام کے ناشتے کا

وقت ہو گیا ہے اور تمہارے ابا جان آنے والے ہیں، اس لیے اب یہاں سے اُٹھ کر میز پر پہنچ جاؤ، آج میں نے بیگم شیرازی کو بھی چائے کی دعوت دے رکھی ہے۔'' اچانک بیگم جمشید نے دروازے پر آ کر کہا۔ وہ چونک اُٹھے۔

''بہت اچھا امی جان! ہم پہنچ رہے ہیں۔''

بیگم جمشید مسکراتے ہوئے چلی گئیں۔ وہ اُٹھے ہی تھے کہ ٹرانسمیٹر پر ایک آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سبز رنگ کا ننھا سا بلب جلنے بجھنے لگا۔

''ہیلو..... میں پہنچ رہا ہوں، خون کا بندوبست ہو گیا ہے۔''

اس جملے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

''خون کا بندوبست۔''

پھر وہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اٹھے اور ناشتے کی میز پر آئے۔ یہاں بیگم شیرازی موجود تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ بیگم شیرازی کا رنگ زرد تھا اور وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھیں۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ انداز انسپکٹر جمشید کا تھا۔ فرزانہ نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ جونہی انسپکٹر جمشید کی نظر بیگم شیرازی پر پڑی وہ چونک اُٹھے۔

''ارے! آپ کو کیا ہوا؟'' ان کے منہ سے نکلا۔

☆☆

سب کی نظریں بیگم شیرازی پر جم گئیں۔ ان کا رنگ ہلدی کی مانند زرد نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ وہ بہت صحت مند تھیں اور سرخ سی تھیں۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے پانچوں کو شام کے کھانے پر بلایا تھا۔ اس وقت بھی بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔

''میں خود حیران ہوں کہ یکا یک مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کل میں اٹھی تو زبردست کمزوری محسوس کی، بلکہ اُٹھتے وقت مجھے چکر بھی آ گیا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا تو زرد رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ آج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اسے بھی بہت حیرت ہوئی وہ میری بیماری کو سمجھ نہیں سکا، تاہم اس نے طاقت کی دوائیں لکھ دی ہیں، میں نے وہ دوائیں شروع کر دی ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''اگر بیماری اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو پھر آپ کو کسی اور ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے تھا۔'' انسپکٹر جمشید نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں، صبح ڈاکٹر انصاری سے جا کر ملوں گی، سنا ہے، وہ شہر کا سب سے مشہور ڈاکٹر ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ہاں! مشہور بھی اور مہنگا بھی، آپ اس کے پاس ضرور جائیں، لیکن بات ہے، بہت عجیب۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''خیر دیکھا جائے گا، آیئے چائے پئیں۔'' بیگم شیرازی بولیں۔

اور وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئے، لیکن ابھی چائے شروع کی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ انسپکٹر جمشید نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے فون کا ریسیور اُٹھایا اور بولے:

''ہیلو! جمشید بول رہا ہوں۔''

''جمشید فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔'' انہیں خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

''ارے رحمان تم.... کیا بات ہے، خیر تو ہے، مجھے کہاں بلا رہے ہو۔'' انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے، کیونکہ خان رحمان کی آواز میں گھبراہٹ شامل تھی۔

''میں غلام جیلانی کے گھر سے بول رہا ہوں، تم انہیں جانتے ہی ہو گے۔

اُون کے سب سے بڑے تاجر ہیں، اور میرے دوست ہیں، یہاں تمہاری خاص ضرورت ہے، بہت اہم معاملہ ہے، اس لیے فوراً آ جاؤ۔'' وہ کہتے چلے گئے۔

''اچھی بات ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ ان کی طرف مڑتے ہوئے بولے:

''خان رحمان نے مجھے ایک جگہ بلایا ہے، کوئی اہم معاملہ ہے، تم لوگ چائے پیو۔''

''نہیں ابا جان! ہم بھی چلیں گے، ورنہ ہم الجھن میں رہیں گے۔''

''اچھا چلو، بیگم تم بیگم شیرازی کو جانے نہ دینا، یہ رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھائیں گی، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کہاں پکاتی پھریں گی۔'' انہوں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے بھائی جان! اس کی ضرورت نہیں۔'' بیگم شیرازی جلدی سے بولیں۔

''اس کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے کہا اور محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

محکمے نے چند روز پہلے انہیں جیپ دے دی تھی، اگرچہ وہ انکار کرتے رہے تھے، لیکن آئی جی نہیں مانے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ موٹر سائیکل ان کیلئے ناکافی ہے، اکثر ان چاروں کو اچانک کسی مہم پر جانا پڑ جاتا ہے تو مشکل پیش آتی ہے۔ اس طرح انسپکٹر جمشید کو ان کی بات ماننا پڑی، لیکن اس کے باوجود انسپکٹر جمشید کو جب تنہا کہیں جانا پڑتا تو اپنی موٹر سائیکل ہی استعمال کرتے تھے، جیپ میں بیٹھ کر وہ غلام جیلانی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں حیرت تھی کہ خان

رحمان وہاں کیا کر رہے ہیں اور انہیں کیا پریشانی آ پڑی ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد غلام جیلانی کی شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ گھنٹی بجانے پر ان کے ملازم نے دروازہ کھولا اور انہیں اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں انہیں خان رحمان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک عورت اور دو ملازم نظر آئے۔

''السلام وعلیکم۔'' چاروں نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک ساتھ کہا۔

''وعلیکم السلام.... آؤ آؤ جمشید، ہم تمہارا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔''

''خیر تو ہے۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' خان رحمان نے جلدی سے کہا، پھر انہیں ساری بات بتا دی، ڈاکٹر انصاری کا جو خیال تھا، وہ بھی سنا دیا، وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے طاہر جیلانی کا معائنہ کیا۔ خاص طور پر اس کے گلے کو عدسے کی مدد سے دیکھا، وہاں دو باریک سے نشان موجود تھے، ایسے نشان جیسے کسی چیونٹی کے کاٹنے سے بن جاتے ہیں یا انجکشن کی سوئی چھوڑ دیتی ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی ان نشانوں کو دیکھا، پھر وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی، پھر اس خاموشی میں انسپکٹر جمشید کی آواز اُبھری:

''میں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، ان واقعات کا تعلق فرانس کی سرزمین سے بتایا جاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ ان واقعات میں حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ میں آپ کو مختصر طور پر بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر ڈریکولا روحانیت کا ماہر تھا، اس نے مرتے ہوئے اپنی روح ایک مُردہ جسم میں داخل کر لی، تاکہ ہمیشہ زندہ رہ سکے۔ لیکن اس جسم کی خوراک صرف خون تھی۔ اب وہ خون پی کر زندہ رہ سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک لڑکی

کو اپنا شکار بنایا، وہ اس کے گھر میں رات کے وقت داخل ہوا اور اس نے نوکیلے دانت اس کے گلے میں گاڑ دیئے۔ لڑکی کی آنکھ کھل گئی، اس نے دیکھا، ایک خوفناک سا آدمی اس کے اوپر جھکا ہوا ہے، اس کا لباس سیاہ ہے، چہرے پر بھیانک مسکراہٹ ہے، بازوؤں پر اس کا لباس اس طرح لٹک رہا ہے جیسے وہ لباس نہ ہو، اس کے بازوؤں کے پر ہوں، وہ اسے کوئی بہت بڑی چمگادڑ لگا، لیکن اس پر تو بے ہوشی سی طاری تھی، وہ جاگ بھی رہی تھی اور نیند کے عالم میں بھی تھی، کافی دیر تک وہ خوفناک آدمی اس کے گلے سے چمٹا رہا، پھر الگ ہٹ گیا، اس کے ہونٹ خون سے تر تھے، اس کے ساتھ ہی لڑکی کو نیند آ گئی۔

دوسری رات کو وہ پھر لڑکی کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے پھر اس کا خون پیا اور چلا گیا۔ جاتے وقت وہ کھڑکی میں سے کود گیا، حالانکہ کمرہ دوسری منزل پر تھا، ساتھ ہی لڑکی نے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں بھی سنی تھی، یہ آواز اس نے اس وقت بھی سنی تھی۔ جب وہ اندر آیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ شخص اُڑ سکتا ہے۔ دوسری طرف لڑکی کے گھر والے پریشان تھے، ڈاکٹر بھی پریشان تھے، ابھی وہ اس بیماری کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ لڑکی مر گئی، اسے دفن کر دیا گیا، لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ مری نہیں، اب وہ ڈریکولا کی ایک ساتھی بن کر اُٹھے گی۔ پھر وہ اپنی قبر سے نکل آئی اور ڈریکولا کی طرح لوگوں کا خون پینے لگی۔ اس طرح وہ بھی ڈریکولا کی ساتھی بن گئی۔ ان کے ساتھیوں میں بہت تیزی سے اضافہ ہونے لگا، پھر انہوں نے اپنا ایک محل بنا لیا اور اس میں رہنے لگے۔

یہ تو ہے وہ کہانی جو بار بار شائع ہوئی اور لوگوں نے پڑھی، اس کے بعد جو

واقعات بیان کیے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ڈریکولا اور اس کے ساتھیوں کو مارنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا، مگر وہ کسی طرح بھی نہ مرتے تھے، گولی سے زخمی ضرور ہو جاتے تھے، لیکن ہوا میں اُڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے کسی کو ان کے ٹھکانے کا پتا نہیں تھا۔ آخر ان کا علاج ڈھونڈ لیا گیا اور اب یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے آدمی کے عین دل میں اگر لکڑی کی میخ ٹھونک دی جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکتا، لیکن اب ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ فرانس کو ان کی سرزمین کہا جانے لگا ہے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

''آپ کا یہ کہانی سنانے سے کیا مطلب ہے، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، ہمارے شہر میں ڈریکولا کو کوئی ساتھی آ گیا ہے۔'' محمود نے سوال کیا۔

''میں ابھی کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ ڈریکولا کی کہانیاں کیا ہیں انہوں نے کہا۔

''پھر اب تمہارا کیا پروگرام ہے، تم طاہر جیلانی کے لیے کیا کرو گے۔'' خان رحمان نے پوچھا۔

''طاہر جیلانی کی حفاظت کے لیے تو کچھ نہ کچھ کر ہی لیا جائے گا، مجھے تو فکر ان بچوں کی ہے۔ جن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں... اور وہ ڈریکولا کا شکار بننے والے ہوں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''اوہ! ان سب کے منہ سے نکلا، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''ارے!'' اچانک انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا اور وہ انہیں گھورنے لگے۔ ان کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ پھر ان کا کپکپاتا ہوا ہاتھ فون کی طرف بڑھا، انہوں نے نمبر گھمائے اور بولے:

''ہیلو.... کون.... ہاں.... بیگم یہ میں ہوں.... دیکھو.... بیگم شیرازی کو ان کے گھر ہرگز نہ جانے دینا، ان کی بیماری کا مجھے پتا چلا گیا ہے، میں ابھی واپس آ رہا ہوں۔ وہ اپنے گھر ہرگز نہ جانے پائیں۔''

ان کے الفاظ نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انسپکٹر جمشید کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔

☆☆☆

کانچ کا ٹکڑا

"اُف اللہ! تو کیا آپ کے خیال میں بیگم شیرازی بھی کسی ڈریکولا کا شکار ہوئی ہیں۔" فرزانہ نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے، جب کہ ڈاکٹر کو ان کی بیماری بھی سمجھ میں نہیں آئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ ہم کن حالات کا شکار ہو گئے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"حالات تو ہمیں ہمیشہ ہی شکار کرتے رہتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، ادھر آنٹی کا سلسلہ ہے اور ادھر طاہر جیلانی صاحب کا۔" فاروق نے کہا۔

"ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، میں اور فرزانہ واپس جائیں گے اور بیگم شیرازی کی حفاظت کریں گے، تم دونوں اپنے انکل کے ساتھ یہاں رہو گے اور طاہر جیلانی کو نظروں میں رکھو گے۔" انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

"لیکن ابا جان! اس طرح تو یہ تین ہو جائیں گے اور ہم دو ہی رہ جائیں گے۔" فرزانہ نے اعتراض کیا۔

"اور امی جان کہاں گئیں۔" محمود مسکرایا۔

"اوہ ہاں! بالکل ٹھیک۔ تو پھر چلیے امی اور آنٹی پریشان ہوں گی۔"

"ہاں، بس چلتے ہیں، میں ان تینوں کو کچھ ہدایات دے دوں۔"

یہ کہہ کر وہ محمود، فاروق اور خان رحمان کو الگ ایک کونے میں لے گئے اور دبی آواز میں انہیں کچھ کہنے لگے۔ آخر میں انہوں نے کہا۔

"رحمان! تمہارے پاس تمہارا پستول تو ہوگا۔"

"نہیں! میں یہاں اپنے دوست کے بیٹے کی بیماری کی خبر سن کر آیا تھا، پستول کیسے ساتھ لاتا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب تھا، گھر میں تو ہوگا۔"

"ہاں بھلا گھر میں کیوں نہ ہوگا۔" وہ بولے۔

"تو جا کر وہ پستول لے آؤ، یا ظہور کے ذریعے منگالو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ تو پستول کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کانپتا ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"ارے! وہ کیوں؟"

"کہیں پستول چل نہ جائے، خیر .... تم فکر نہ کرو، میں ابھی جا کر پستول لے آتا ہوں، ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا، یہ ڈریکولا قسم کی چیزیں، جہاں تک میرا خیال ہے، دن کی روشنی میں حملہ آور نہیں ہوتیں۔"

"ہاں! دن کے وقت انہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

بس تو پھر، فکر کی کیا بات ہے، میں ابھی جا کر لے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ اچھا۔"

اب ہم چلتے ہیں، ہمیں ادھر جا کر بھی کچھ انتظامات کرنے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ فکر نہ کریں، آج رات ڈریکولا طاہر جیلانی کا کچھ

نہیں بگاڑ سکتے گا۔'' محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید اور فرزانہ اُن سے رُخصت ہو کر گھر پہنچے تو بیگم جمشید اور بیگم شیرازی کے رنگ واقعی اُڑے ہوئے تھے۔

''آپ نے وہ فون کیوں کیا تھا۔'' بیگم جمشید نے جلدی سے پوچھا۔

''ان کا تنہا رہنا ٹھیک نہیں، فکر کی کوئی بات نہیں، آپ ہمارے ساتھ نہایت سکون سے رہیں گی، بیگم آج تم انہیں اپنے ساتھ سُلا لینا، میں فرزانہ کے ساتھ ان کے کمرے میں سو جاؤں گا۔'' انہوں نے کہا۔

''آخر بات کیا ہے۔ آپ نے فون پر کہا تھا، میری بیماری سمجھ گئے ہیں۔'' بیگم شیرازی نے کہا۔

''ہاں! اور آپ کے علاج کی تیاری کر رہا ہوں، اسی لیے آپ کو گھر نہیں جانے دیا۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور پھر فرزانہ سے بولے۔

''آؤ فرزانہ ہم تمہاری آنٹی کے گھر کے سب دروازے بند کر آئیں۔''

''جی بہتر۔'' فرزانہ ان کا مطلب سمجھ کر بولی۔

دونوں بیگم شیرازی کے گھر میں داخل ہوئے، سب سے پہلے انہوں نے تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کیے اور پھر بیگم شیرازی کے سونے کے کمرے کا معائنہ کرنے لگے۔ انہوں نے ایک ایک انچ دیکھ ڈالا، لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔

''اس نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا، کہیں وہ سچ مچ ڈریکولا ہی تو نہیں ہے۔'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''اگر وہ ڈریکولا ہے تو پھر اسے سراغ چھوڑنے اور نہ چھوڑنے کی کیا

پرواہ ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اس کا مطلب ہے، اگر ہمیں کوئی سراغ مل جاتا ہے تو وہ واقعی ڈریکولا ہے۔'' فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ابھی یہ بھی نہیں کہا جا سکتا، حالات غیر یقینی ہیں اور ہم جب تک خود اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، کچھ نہیں کہہ سکتے، آؤ ہم برآمدے اور صحن کا جائزہ لیں۔''

وہ کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے کا جائزہ لینے لگے، اچانک کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ انسپکٹر جمشید نے جھک کر دیکھا برآمدے میں بلب روشن تھا، اس کی روشنی میں انہوں نے دیکھا، وہاں کانچ کا ایک ننھا سا ٹکڑا پڑا تھا اور اس ٹکڑے پر خون لگا تھا۔

☆☆

رات سرد اور تاریک تھی، چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور آسمان پر ابر تھا، اس لیے تارے بھی نہیں نکلے تھے، سونے پر سہاگہ یہ کہ ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی، ایسے میں فاروق کے دانت بج اُٹھے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، لیکن محمود کو اس پر غصہ آ گیا تھا:

''اگر تمہارے دانتوں کی آواز ڈریکولا کے کانوں تک پہنچ گئی، تو وہ ڈر کر بھاگ جائے گا۔''

''ہائیں! میرے دانت بجنے کی آواز اس قدر خوفناک ہے، پھر تو اسے ٹیپ کرا لینا چاہیے اور جہاں کہیں بھی ڈریکولا کے آنے کا خطرہ ہو، وہ ٹیپ بجا دینا چاہیے، ویسے کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کر ڈریکولا کے کان بھی ہوتے ہیں۔'' فاروق شوخ لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"کیوں ڈریکولا کے کان کیا کسی عورت نے کھا لیے تھے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بھوت تو ڈریکولا سے ویسے ہی ڈر جائے، یار کیا خیال ہے، اگر ان دونوں کی کشتی کرا دی جائے۔" فاروق نے کہا اور خان رحمان بے ساختہ مسکرا دیے۔

تینوں طاہر جیلانی کے کمرے میں موجود تھے۔ انہوں نے غلام جیلانی، اس کی بیگم اور گھر کے دوسرے افراد کو آرام سے سو جانے کی ہدایت کی تھی اور خود طاہر کے کمرے میں رات بھر جاگتے رہنے کا پروگرام بنایا تھا۔ طاہر نیند کے انجکشن کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہا تھا۔

"لو! کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"جہاں تم کہو، پہنچ جاتا ہوں۔" فاروق بولا۔

"فی الحال تو اسی کمرے میں موجود رہو۔"

"اچھی بات ہے، ہاں تو تم میرے دانتوں کی آواز کی بات کر رہے تھے۔ اوّل تو ڈریکولا کے کان اتنے تیز نہیں ہو سکتے، دوسرے ابھی ہم یہ بھی نہیں جانتے، وہ ڈریکولا ہے بھی یا نہیں۔" فاروق بولا۔

"اگر وہ ڈریکولا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟" خان رحمان نے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے ڈریکولا کا بھوت ہو۔" فاروق کے منہ سے سوچے سمجھے بغیر نکل گیا۔

"ڈریکولا کا بھوت؟" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"ہاں! ڈریکولا کا بھوت!"

"بھئی واہ! یہ نئی بات ہوئی، ایک ڈریکولا ہی کیا کم تھا کہ تم نے اس کے ساتھ بھوت کا بھی اضافہ کر دیا۔" خان رحمان مسکرائے۔

"ویسے خیال ہے خوب!" محمود مسکرایا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا، ہمارے ملک میں بھلا ڈریکولا کہاں سے آ سکتا ہے، یہ ضرور اس کا کوئی بھوت ہے جو فرانس سے بھٹکتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا ہے۔"

"اگر وہ ڈریکولا کا بھوت ہے تو پھر تو اس کا مقابلہ کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔" خان رحمان گھبرا کر بولے۔

"فکر نہ کریں انکل، ہم نے بڑے بڑے بھوتوں کو دیکھ رکھا ہے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"لیکن ڈریکولا کے بھوت کو نہیں دیکھا ہوگا۔" محمود نے کہا۔

"ہم تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر چکے ہیں جن کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں، ان میں لکڑیاں پھنسا چکے ہیں، دوسرے یہ کہ اس کمرے میں ہم خود موجود ہیں، ان حالات میں ڈریکولا یا اس کے بھوت کی کیا دال گلے گی۔" فاروق نے کہا۔

"ہائیں! وہ دال کھاتا ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"میں نے محاورہ استعمال کیا ہے۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"تو کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔" محمود تڑ سے بولا۔

"لو اور سنو! انکل میں کوئی دوڑ رہا ہوں۔" فاروق خان رحمان کی طرف مڑا۔

"نہیں تو.... تم تو چل بھی نہیں رہے، ہمارے پاس بیٹھے ہو۔" خان

رحمان گھبرا کر بولے۔

''تو پھر اسے سمجھا دیں، جھوٹ نہ بولا کرے۔'' فاروق مسکرایا۔

''جھوٹ بولنا تو واقعی بہت بُری بات ہے۔'' خان رحمان بولے۔

''انکل آپ بھی اس کی باتوں میں آگئے، میں نے بھی تو خراب میں محارہ بولا تھا۔''

''ارے ہائیں! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہونہیں! میں جانتا ہوں، تم محاوروں کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔'' محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

''تو ہم میں سے محاوروں کو بُری طرح کون سمجھتا ہے، ذرا یہ بھی بتاتے چلو، کیونکہ میں محاوروں کی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا، انکل آپ کر سکتے ہیں۔'' فاروق کہتے کہتے خان رحمان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہرگز نہیں، محاوروں کی بے عزتی بھی بُری بات ہے، انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''انکل! آپ اس کی اُوٹ پٹانگ باتوں میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اور کیا کروں۔ اگر خاموش بیٹھ گئے تو رات کس طرح گزرے گی، یہ پہاڑ جیسی رات۔'' خان رحمان نے چھت کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

''آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ رات پہاڑ جیسی کس طرح ہوسکی ہے... رات کالے دیو کی طرح تو ہوسکتی ہے، پہاڑ جیسی ہرگز نہیں ہوسکتی۔'' فاروق نے کہا۔

''یہ بھی محاورہ ہے۔'' محمود مسکرایا۔

''کہیں ہم پر محاوروں کا بھوت تو سوار نہیں ہوگیا۔'' فاروق کے منہ سے نکلا۔

''نہیں تو..... ہم پر تو ڈریکولا کا بھوت سوار ہے۔'' محمود نے ہنس کر کہا۔

''ارے باپ رے۔'' فاروق نے بوکھلا کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا پھر فوراً پُرسکون ہو کر بولا:

''یار کیوں مذاق کرتے ہو، میرے سر پر تو میرے بالوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ویسے تم دونوں کا خیال ہے، آج یہاں وہ ڈریکولا کا بچہ آئے گا۔'' خان رحمان نے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا، سننے میں تو یہی آیا ہے کہ ڈریکولا اپنے شکار کا خون اس وقت تک پیتا رہتا ہے جب تک وہ مر نہیں جاتا اور قبر میں نہیں پہنچ جاتا، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ قبر میں جانے کے بعد جب وہ اس میں سے اُٹھے گا تو اس کا ساتھی بن چکا ہوگا۔''

''پھر تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔'' خان رحمان بولے۔

''جی ہاں! اسی لیے تو ہم یہاں موجود ہیں۔'' محمود بولا۔

''رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ گیارہ اور بارہ کے درمیان آتا ہے۔ اس لیے اب ہمیں ابا جان کی ہدایات پر عمل شروع کردینا چاہیے۔'' فاروق بولا۔

''ٹھیک ہے، انکل آپ یہیں ٹھہریں۔ ہم اپنا کام ختم کر کے آتے ہیں،

کھنڈرات کی آواز

''یہ تو کانچ کا ٹکڑا ہے۔'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''ہاں! ہم جانتے ہیں، بیگم شیرازی بہت صفائی پسند ہیں، ان کے گھر میں صفائی کرنے والی ہر روز آتی ہے اور گھر کے ایک ایک انچ کو صاف کرتی ہے، پھر یہ ٹکڑا یہاں کہاں سے آ گیا۔ اور اس پر خون بھی لگا ہوا ہے۔''

''ہو سکتا ہے، یہ اسی صفائی کرنے والی کا خون ہو۔'' فرزانہ بولی۔

''برآمدے میں خون کا کوئی اور دھبہ کہیں نظر نہیں آ رہا، یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ صرف اس ٹکڑے پر خون لگا ہوا ہے۔ خیر ہم اس ٹکڑے کو محفوظ رکھ لیتے ہیں۔ اس پر بعد میں غور کریں گے۔ میرا خیال ہے، یہاں کوئی اور کام کی چیز نہیں ہے، اس لیے واپس چلتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ڈریکولا اگر یہاں آیا، تو آنٹی کو نہ پا کر کس قدر مایوس ہو گا، کیا وہ واپس چلا جائے گا۔'' فرزانہ نے سوال کیا۔

''واپس جانے کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے، لیکن نہیں، وہ یہاں سے ہو کر سیدھا ہمارے ہاں آئے گا۔'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں، اسے کس طرح معلوم ہو جائے گا کہ آنٹی ہمارے ہاں ہیں۔''

خون کی بُو سے، یہ لوگ اپنے شکار کی بُو بہت دُور سے محسوس کر لیتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''آپ تو اس انداز سے کہہ رہے ہیں جیسے ڈریکولوں کا سچ مچ وجود ہے جب کہ میں اسے محض کہانیاں خیال کرتی ہوں۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ڈریکولا کا کوئی وجود نہ ہو اور یہ صرف کہانیاں ہوں، لیکن ہمارے سامنے جو حالات پیش آئے ہیں، ان کی روشنی میں دعوے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، دیکھو نا، آخر طاہر جیلانی کے جسم کا خون کہاں چلا گیا، بیگم شیرازی کیوں زرد نظر آ رہی ہیں، ڈاکٹروں کی سمجھ میں ان لوگوں کی بیماری کیوں نہیں آئی، انسانی جسم سے خون صرف چوٹ لگنے یا کٹنے کی صورت میں نکلتا ہے، طاہر جیلانی کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ملا، البتہ اس کی گردن پر ضرور انجکشن کی سوئیوں جیسے دو نشان موجود ہیں۔'' انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

''اور ہم آنٹی کے گلے کو دیکھنا بالکل ہی بھول گئے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''اوہ ہاں! آؤ چلیں، پہلے ان کے گلے کا معائنہ کریں۔ پھر ان کی حفاظت کے سلسلے میں ضروری اقدامات کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ بیگم شیرازی کے گھر سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو انہوں نے تالا لگا دیا، تاکہ ڈریکولا تالا دیکھ کر ہی سمجھ جائے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر لیں اور اندرونی کمرے میں آئے۔ یہاں بیگم جمشید اور بیگم شیرازی بستروں میں دُبکی باتیں کر رہی تھیں۔

''میں آپ کی گردن کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر جمشید نے بیگم شیرازی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب.... کیا مجھے گلے کی کوئی بیماری ہے اور یہ آپ ڈاکٹر کب سے ہو گئے۔" بیگم شیرازی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، میں ایک خیال کے تحت آپ کی گردن دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

بیگم شیرازی نے گردن کے گرد سے دوپٹہ ہٹالیا اور چہرہ اوپر کر لیا۔ انسپکٹر جمشید نے جیب سے عدسہ نکالا اور ان کی گردن پر جھک گئے۔ پھر انہوں نے عدسہ فرزانہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے عدسہ میں سے آنٹی کی گردن دیکھی اور پھر زور سے چونکی۔ انجکشن جیسے نشان ان کی گردن پر بھی موجود تھے۔ دونوں سکتے میں آگئے، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں، یہ تو سچ مچ کسی ڈریکولا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اصل بات ان دونوں کو بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتے تھے، تا ہم بیگم جمشید نے بھانپ لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ انہوں نے پریشان ہو کر کہا:

"خیر تو ہے، آپ ان کی گردن پر کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں، یونہی ایک خیال آیا تھا، لیکن فکر والی کوئی بات نہیں، رات کافی گزر چکی ہے، اب آپ دونوں سونے کی کوشش کریں.... کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیں۔

"کیا کوئی خطرہ ہے۔" بیگم شیرازی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہیں! ہمارے ہوتے ہوئے خطرے کی کیا بات ہو سکتی ہے۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید باہر نکل آئے تا کہ وہ کوئی اور سوال نہ کر بیٹھیں۔

ساتھ ہی انہوں نے دروازے کی چٹخنی لگنے کی آواز سنی۔

"تمہاری امی کو شک ہو گیا ہے، وہ جان گئی ہیں کہ خطرہ ہے۔" انسپکٹر

جمشید نے سرگوشی کی۔

"یہ تو اور اچھی بات ہے، اب وہ بھی ہوشیار رہیں گی۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن ان کے ہوشیار ہونے سے کچھ فائدہ نہیں، اگر ڈریکولا ان کے سامنے آگیا تو وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہ جائیں گی۔"

"خیر دیکھا جائے گا... اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"بس دیکھتی جاؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور برآمدے کے فرش پر جھک گئے۔ عین اسی وقت انہوں نے کسی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔

ان کے کان کھڑے ہوئے، وہ چونک کر سیدھے ہو گئے اور پھر بے ساختہ بیرونی دروازے کی طرف لپکے، بیرونی دروازے میں لگا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا، اس کی کرچیاں اندر کی طرف بکھر گئی تھیں۔ انسپکٹر جمشید بلا کی تیزی سے دروازے تک پہنچے۔ چٹخنی بھی گری ہوئی تھی، لیکن اندر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ کیا شیشہ توڑ کر دروازہ کھولنے والا باہر ہی رہ گیا تھا، لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ان کے ذہن تیزی سے گردش کرنے لگے۔

"ابا جان! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی اندر داخل ہو چکا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہم برآمدے میں سے آرہے ہیں.... اگر اس نے ہمارے قدموں کی آواز سن لی تھی اور وہ اندر بھی داخل ہو چکا تھا تو پھر دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں.... یا وہ باہر نکل گیا یا وہ تمہارے کمرے میں چھپ گیا ہے۔ تمہارے کمرے میں ہونے کی صورت میں بھی وہ جب چاہے پاس باغ والی کھڑکی کے راستے فرار ہو سکتا ہے، اس لیے تم فوراً پائیں باغ میں پہنچو، میں ادھر سے

تمہارے کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔"

"بہت بہتر!" فرزانہ نے کہا اور دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پائیں باغ میں پہنچ کر اس نے دیکھا، کھڑکی بند تھی۔ وہ اس کے نیچے چلی آئی اور کان اندر سے آنے والی کسی آواز کی طرف لگا دیے، لیکن اندر تو گہری خاموشی طاری تھی، اس نے سوچا، کیا ابھی تک ابا جان اندر داخل نہیں ہوئے، شاید وہ اسے کھڑکی کے نیچے پہنچنے کی مہلت دینے کے لیے صحن میں ہی رُک گئے ہیں۔ اسی وقت اس کے کان کھڑے ہو گئے، جسم میں سنسنی کی لہر بجلی کی طرح سرایت کر گئی.... اس نے ایک عجیب خوفناک قسم کی آواز سنی تھی۔

ایسی آواز اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ آواز نہ تو کسی انسان کے حلق سے نکلی تھی اور نہ کسی درندے کے، فرزانہ اندازہ لگا بھی نہ سکی کہ آواز کس جان دار کی تھی۔

اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے چلے گئے۔ عین اسی وقت ایک فائر کی آواز گونجی۔

☆☆

ان کے سامنے زندگی کا سب سے حیران کن ترین منظر تھا خان رحمان کمرے کے فرش پر اوندھے منہ بے ہوش پڑے تھے۔ ان کا پستول ان کے سر سے تھوڑی دور پڑا تھا۔ طاہر جیلانی بستر پر دراز تھا اور اس پر ایک عجیب خوف ناک آدمی جھکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا اور شاید سر سے پیر تک ایک ہی کپڑا تھا۔ دونوں بازوؤں میں بھی کپڑا لٹک رہا تھا جیسے چمگادڑ کے پر ہوں۔ ابھی وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے، کیوں کہ چہرہ تو طاہر جیلانی پر جھکا

ہوا تھا۔ خدا جانے وہ اس کے چہرے پر جھکا کیا کر رہا تھا۔ محمود اور فاروق کے اوسان خطا ہو چکے تھے، یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی کہ ایک منٹ کے اندر کیا ہو گیا تھا، خان رحمان جیسے دلیر آدمی کس طرح بے ہوش ہو گئے تھے، کیا انہیں پستول چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اچانک محمود چونک اُٹھا، اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور پھر لپک کر پستول اُٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی فاروق بھی جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"خبردار! گولی مار دیں گے، سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس عجیب مخلوق نے کوئی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی، نہایت سکون سے اسی طرح جھکے جھکے گردن ان کی طرف گھمائی اور وہ لرز اُٹھے۔

ان کے سامنے ایک خوفناک مخلوق موجود تھی۔ اس کے سامنے کے دو دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک ایسی خوفناک چمک تھی، جو دوسروں کو بے ہوش کر دینے کے لیے کافی تھی۔ چہرے پر موت کی زردی پھیل ہوئی تھی، دانتوں کے ساتھ ہونٹ بھی خون سے تر تھے۔ اس کی ناک لمبی تھی۔ جبڑوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں اور قد بہت لمبا تھا۔ یہ بالکل وہی حلیہ تھا جو ڈریکولا کی کہانیوں میں اس کا بیان کیا جاتا ہے۔

ان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور پھر ایک ایک قدم ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"محمود! فائر کرو۔" فاروق نے تیز آواز میں کہا۔

محمود نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے کو دھماکا ہوا، ڈریکولا بدستور ان کی طرف بڑھتا رہا، گولی نے اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا

تھا۔ دونوں کے جسموں میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ اچانک محمود کو کوئی خیال آیا، اس نے اس کے بازو کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا، ڈریکولا کے منہ سے ایک ہولناک چیخ نکلی اور اس کے اُٹھتے قدم رُک گئے، چند سیکنڈ کے لیے وہ انہیں گھورتا رہا، پھر کھڑکی کی طرف مڑا اور گویا ہوا میں اڑتا ہوا اس تک جا پہنچا، انہیں یہی معلوم ہوا تھا جیسے وہ ہوا میں اُڑتا ہوا کھڑکی تک پہنچا ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کے پٹ کھول ڈالے مگر کھڑکی میں تو سلاخیں لگی تھیں، اس نے سلاخوں پر ایک زوردار ہاتھ رسید کیا، کھڑکی کی چوکھٹ اُکھڑ گئی اور دوسری طرف جا گری ۔ یہ دیکھ کر محمود اور فاروق کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ڈریکولا بلا کی طاقت رکھتا ہے، اور پھر انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ عجیب منظر دیکھا، ان کی آنکھوں کے سامنے ڈریکولا نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی۔

دونوں بے تحاشہ دوڑتے ہوئے کھڑکی تک آئے۔ انہوں نے دیکھا، ڈریکولا تیر کی طرح نیچے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی پرندہ ہوا میں غوطہ لگاتا ہے، پھر اس کے قدم زمین سے ٹکرائے، وہ اچھلا.... جیسے کوئی گیند اچھلتی ہے اور پھر جونہی دوبارہ قدم زمین سے لگے۔ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔

”فاروق جلدی کرو، کہیں وہ نکل نہ جائے۔“ محمود نے گھبرا کر کہا۔

وہ پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے زینے تک آئے اور سیڑھیاں اُترنے لگے۔ انہوں نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں بھی سنیں، شاید گھر کے لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی وہ اس سڑک پر دوڑنے لگے جس پر ڈریکولا کو دوڑتے دیکھا تھا۔ دور بہت دور وہ گویا ہوا میں اڑا جا رہا تھا،

اس کے قدم زمین پر لگتے بھی دکھائی دیتے تھے اور پھر وہ اس طرح اُچھلتا جیسے سڑک اسے اُوپر اچھال رہی ہو۔ ان چھلانگوں نے اس کی رفتار کو بہت زیادہ کر دیا تھا اور ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ دوڑتے ہوئے اس تک جا پہنچیں، تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دوڑتے رہے۔

وہ دوڑتے چلے گئے، اگرچہ اب ڈریکولا انہیں نظر بھی نہیں آ رہا تھا، انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا، اس وقت تک دوڑتے رہیں گے جب تک کہ اس کے ٹھکانے پر نہیں پہنچ جاتے۔ انہیں یہ بات معلوم تھی، جس سڑک پر وہ چلے جا رہے ہیں، وہ شہر سے باہر ویرانوں میں لے جاتی ہے، ان ویرانوں میں بے تحاشہ کھنڈرات بھی تھے اور ان کھنڈرات میں کسی حد تک قابلِ استعمال عمارات بھی تھیں، یہ اس قدر بوسیدہ اور پُرانی تھیں کہ کوئی ان کی طرف رُخ کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور کچھ عرصے سے تو شہر میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ان کھنڈرات میں کوئی بدروح رہتی ہے جو راتوں کو عجیب وغریب آوازیں نکالتی ہے، پاس سے گزرنے والے اگر ان آوازوں کو سن لیتے ہیں تو بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں۔ اس لیے لوگوں نے رات کے وقت تو کیا، دن کے اوقات میں بھی ان کھنڈرات کی طرف سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔

محمود اور فاروق بے تحاشہ دوڑے ہوئے اب انہی کھنڈرات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ محمود کے دائیں ہاتھ میں ابھی تک پستول دبا ہوا تھا۔ ڈریکولا اب ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ آدھ گھنٹے تک دوڑتے رہنے کے بعد وہ شہری حدود سے باہر نکل آئے اور اب وہ ویرانہ شروع ہو گیا۔

یہاں ہولناکی کا راج تھا، ایک عجیب اور خوفناک سا سنسان پن طاری تھی۔ اب انہوں نے دوڑنا بند کر دیا اور آہستہ آہستہ کھنڈرات کی طرف بڑھنے

لگے، وہ سمجھ گئے، انہی میں سے کسی ایک کھنڈر میں ڈریکولا رہتا ہے اور اسی کھنڈر کو تلاش کرنا تھا۔

ایک ایک کھنڈر کا احتیاط سے جائزہ لیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگے، اچانک ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت وہ آواز کھنڈرات کا سینہ چیرتی ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ آواز کان کے پردے پھاڑ دینے والی تھی اور عجیب ترین بات یہ تھی کہ ہر کھنڈر سے اُٹھتی محسوس ہوئی تھی، یہاں تک کہ اس وقت وہ جس کھنڈر میں کھڑے تھے، آواز اس میں سے بھی گونجتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ کپکپا اُٹھے۔

☆☆☆
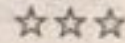
تعاقب میں

انسپکٹر جمشید نے کمرے میں قدم رکھا تو فوراً ہی انہیں احساس ہو گیا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ گہری تاریکی کی وجہ سے وہ اسے دیکھ نہ سکے، کمرے کا بلب بجھا دیا گیا تھا۔ اور برآمدے کا بلب وہ خود بجھا کر آئے تھے۔ دروازہ انہیں کھلا ملا تھا۔

کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ سمجھ گئے کہ وہ جو کوئی بھی ہے، کس کونے میں موجود تھے، تاریکی میں اس پر حملہ کرنا خطرناک ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے، مقابلہ کس سے ہے اور وہ کس قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہے، چنانچہ اندر داخل ہونے کے بعد وہ فوراً فرش پر لیٹ گئے اور دم سادھ لیا۔ ان کا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول ان کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے سانسوں کی آوازہی کے ذریعے نشانہ لیا اور گولی چلانے ہی والے تھے کہ کمرے میں ایک عجیب و غریب آواز گونجی.... انہوں نے ایسی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی، وہ دھک سے رہ گئے، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آواز کی سمت فائر کر دیا۔ گولی کی آواز پورے کمرے میں گونج اٹھی، لیکن جواب میں کوئی چیخ سنائی نہ دی۔ شاید گولی اس کے نہیں لگی تھی۔ اسی وقت انہوں نے محسوس کیا، کوئی ہوا میں اُڑتا ہوا کمرے کے

دروازے سے نکلتا چلا گیا ہے۔ وہ فوراً کمرے سے باہر نکلے اور صدر دروازے کی طرف دوڑے، دروازہ فرزانہ کی وجہ سے اندر سے بند نہیں کیا تھا، انہوں نے باہر نکل کر دیکھا، لیکن کوئی بھی نظر نہ آیا۔ انہوں نے سوچا، کہیں وہ باہر جانے کی بجائے اندر نہ چلا گیا ہو۔ فوراً ہی وہ مڑے اور بیگم کے کمرے کی طرف لپکے۔ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ دروازہ اندر سے بند رکھا جائے، لیکن یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی کہ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے۔

ڈریکولا قسم کا ایک آدمی بیگم شیرازی پر جھکا ہوا تھا اور بیگم جمشید ایک طرف بے ہوش پڑی تھیں۔

"خبردار! سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

ڈریکولا نے پلٹ کر دیکھا اور ان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر چونک اُٹھا۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید حیرت زدہ تھے۔ ان کے سامنے واقعی ایک عدد ڈریکولا کھڑا تھا جب کہ وہ اب تک یہ سمجھتے رہے تھے کہ یہ سب شرارت کوئی چالاک آدمی کر رہا ہے، لیکن اس شخص کی شکل صورت اس حلیے کے عین مطابق تھی، جو فلموں میں ڈریکولا کا دکھایا جاتا رہا تھا یا کتابوں میں لکھا گیا تھا۔ ایک پل کے لیے انہوں نے سوچا.... تو کیا واقعی کوئی ڈریکولا ہمارے ملک میں آ گیا ہے، لوگوں کا خون پینے کے لیے اور اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے، دوسرے ہی لمحے وہ چونکے، انہوں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر فائر کر دیا، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اس کے بازو کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس مرتبہ ڈریکولا کے منہ سے بھیانک چیخ نکل گئی اور وہ گویا ہوا میں اُڑتا ہوا کمرے کی دروازے کی طرف چلا، یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے ایک

ساتھ کئی فائر کر ڈالے، اس کے باوجود وہ ان کے سر کے اُوپر سے گزرتا ہوا برآمدے میں جا پہنچا اور وہاں سے بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ انسپکٹر جمشید جتنی دیر میں بیرونی دروازے تک پہنچے، وہ باہر نکل چکا تھا۔ باہر نکلتے ہی انہوں نے ڈریکولا کو ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرتے دیکھا، یہ کام فرزانہ نے دکھایا تھا، اس نے اپنی ٹانگ آگے کر دی تھی۔ ڈریکولا اس کی طرف سے بے خبر تھا، اس لیے دھڑام سے گرا، انسپکٹر جمشید نے یہ دیکھ کر فوراً اس پر چھلانگ لگائی، انہیں یوں لگا جیسے وہ کسی لوہے کے بنے ہوئے آدمی پر گرے ہوں، جسم کے مختلف حصوں پر سخت چوٹیں آئیں مگر انہوں نے پروانہ کی اور ڈریکولا کو گلے سے دبوچ لیا، لیکن پھر کئی فٹ اُونچا اُچھلے اور زمین پر آ رہے، ڈریکولا میں خوفناک طاقت تھی، اس نے اپنی طاقت سے کام لے کر انہیں ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح اچھال دیا تھا، دوسرے ہی لمحے وہ ایک بار پھر اُڑا چلا جا رہا تھا، اس کے قدم مشکل سے ہی زمین پر لگتے نظر آتے تھے۔ اتنے وہ دونوں سنبھلے، وہ بہت دُور جا چکا تھا:

"آؤ فرزانہ جلدی کرو، کہیں وہ نکل نہ جائے۔" انسپکٹر جمشید چلائے اور جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ فرزانہ بھی فوراً جیپ پر سوار ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے جیپ کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد اس تک پہنچ جائیں گے، لیکن ان کا یہ خیال غلط نکلا، کیونکہ دو منٹ تک جیپ دوڑتے رہنے کے باوجود انہیں ڈریکولا کہیں نظر نہیں آیا:

"حیرت ہے۔ وہ اتنا تیز کس طرح دوڑ سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"یوں لگتا ہے جیسے وہ اُڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور اگر یہی بات ہے تو

ہم جیپ پوری رفتار پر چھوڑ کر بھی اسے نہیں پکڑ سکتے۔'' فرزانہ بولی۔

''لیکن ایک انسان کس طرح اڑ سکتا ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔'' انہوں نے کہا۔

''ڈریکولا کے بارے میں تو یہی سنا ہے، وہ تقریباً ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔''

''یہ سب قصے کہانیاں ہیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن اب تو ہم آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''ہو سکتا ہے، وہ جیپ کو آتے دیکھ کر ادھر اُدھر کہیں چھپ گیا ہو اور ہم اس سے آگے نکل آئے ہوں۔'' انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے، پھر کیا ہم واپس چلیں۔'' فرزانہ بولی۔

''نہیں! واپس جا کر بھی ہم اسے نہیں پا سکیں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''کہیں وہ واپس آنٹی تک نہ پہنچ جائے۔'' فرزانہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''کم از کم آج رات وہ دوبارہ ان تک نہیں پہنچ سکتا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''وہ کیوں؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ زخمی ہو چکا ہے اور زخمی حالت میں اسے خون پینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ اپنے ٹھکانے پر جا کر خون روکنے کا بندوبست کرے گا اور آرام کرے گا، کل ہو سکتا ہے، وہ پھر آئے۔'' انہوں نے کہا۔

''آخر یہ ڈریکولا ہمارے شہر میں کہاں سے آ گیا۔'' فرزانہ نے

پریشان ہو کر کہا۔

''آ گیا نہیں، آ گئے، میرا خیال ہے، یہ ایک سے زائد ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اوہ! آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔''

''اس طرح کہ ادھر تو بیگم شیرازی پر حملہ کیا گیا ہے، ادھر طاہر جیلانی کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے، یہ ایک سے زیادہ ہیں۔''

''لیکن ابھی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ادھر بھی ڈریکولا پہنچا ہوگا، ہو سکتا ہے، اسی کو بعد میں ادھر جانا ہو، یا یہ وہاں سے ہو کر آیا ہو۔'' فرزانہ نے اعتراض کیا۔ اس بات کو سن کر انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں مسکرائے، پھر بولے:

''مجھے پہلے ہی اس بات کا خیال تھا اور میں نے محمود اور فاروق کو ہدایت کی تھی کہ اگر ڈریکولا آئے تو گھڑی پر ضرور نظر ڈال لیں۔ میں بھی وقت نوٹ کر چکا ہوں، اس طرح ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ڈریکولا ایک ہی ہے یا ایک سے زائد۔''

''لیکن ابا جان! اس میں اتنی طاقت کیوں ہے۔''

''انسانی جسم میں اصل طاقت خون کی بدولت ہے، اور وہ خون پیتا ہے، نہ جانے اس وقت تک کتنے انسانوں کا خون پی چکا ہوگا، تو پھر اس میں طاقت کیوں نہ ہوگی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ کی بات سن کر میں محمود اور فاروق کے لیے پریشان ہو گئی ہوں۔''

"فکر نہ کرو، شاید وہ بھی ہمیں اسی سڑک پر کہیں مل جائیں، اسی لیے تو میں واپس نہیں مڑا اور آگے چلا آیا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"اوہ!" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"عین اسی وقت انسپکٹر جمشید نے بریک لگائے.... وہ شہری حدود سے باہر نکل آئے تھے اور ویرانوں کی حدود میں آ گئے تھے۔ فرزانہ نے سنا، انسپکٹر جمشید اس طرح بڑبڑائے تھے جیسے خواب میں بولے ہوں۔

"او ہو.... ان کھنڈرات کے بارے میں تو میں بہت کچھ سن چکا ہوں... آؤ فرزانہ ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیں۔"

یہ کہہ کر وہ جیپ سے اُتر آئے۔ فرزانہ نے بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔ دونوں آگے بڑھے اور پھر پہلے کھنڈر میں ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہی وہ زور سے اُچھلے۔

☆☆☆

"یار یہ آواز کیسی تھی؟" محمود کے منہ سے نکلا۔

"یہ شاید کسی روح کی آواز تھی، کیونکہ انسانوں اور درندوں کی آوازیں تو ہم پہچانتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے پہلے بھی کسی روح کی آواز نہیں سنی۔" محمود بولا۔

"نہیں!" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ کس روح کی آواز تھی۔" محمود بولا۔

"اگر یہ روح کی آواز نہیں تھی تو بتاؤ، کس کی تھی۔"

"ڈریکولا کی۔" محمود بولا۔

"ابھی ہم نے اسے ڈریکولا تسلیم نہیں کیا۔" فاروق نے جواب میں کہا۔

"آؤ اس کھنڈر سے باہر نکل کر دیکھیں، شاید ہمیں کوئی سراغ مل جائے۔"

"کیوں ڈریکولا کے ہتھے چڑھنا چاہتے ہو، وہ ہمارا خون پی جائے گا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"اب یہاں تک آئے ہیں تو اس کا ٹھکانہ دیکھ کر ہی واپس جائیں گے۔" محمود نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھکانہ مل جانے کے بعد تم کہو گے، اب ٹھکانہ مل گیا ہے تو ڈریکولا سے کشتی لڑ کر ہی جائیں گے، لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھے اس سے کشتی لڑنے کا کوئی شوق نہیں، تم ضرور اس سے دو دو ہاتھ کر لینا۔"

"گویا تم دُور کھڑے تماشہ دیکھتے رہو گے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"ہاں! اسی طرح ہم ڈریکولا کو شکست دے سکتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"وہ کیسے، ذرا میں بھی تو سنوں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"جب تم اس کا تنہا مقابلہ کرو گے اور میں درمیان میں دخل نہیں دوں گا تو ڈریکولا بہت متاثر ہوگا اور خیال کرے گا کہ ہم کتنے بااصول ہیں کہ ایک کے مقابلے میں صرف ایک آیا ہے، دوسرا اس کی مدد نہیں کر رہا، تو وہ خود اپنی ہار کا اعلان کر دے گا اور اس طرح ہم فتح پا کیں گے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے، ڈریکولا جیسے لوگ کسی اصول کو نہیں مانتے۔" محمود نے انکار میں سر ہلایا۔

"اگر تم سچ مچ اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے میری ایک
تجویز ہے، اگر سننا پسند کرو۔"

"چلو بتاؤ، کیونکہ اس وقت فرزانہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"تجویز یہ ہے کہ ہم ڈریکولا کا ٹھکانہ دیکھ کر یہاں سے واپس چلتے ہیں
اور ابا جان اور فرزانہ کو ساتھ لے کر آتے ہیں، بلکہ انکل رحمان کو بھی ساتھ لے
آئیں گے اور پھر مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔" فاروق نے کہا۔

"ایک دشمن کے مقابلے میں اتنے آدمی ساتھ لاؤ گے، ابھی تو اصول
پرستی کی بات کر رہے تھے۔"

"تم نے خود ہی تو میری وہ بات نہیں مانی تھی۔"

"اچھا بھائی یونہی سہی۔ آؤ پہلے اس کا ٹھکانا تو ڈھونڈ لیں۔" محمود نے
تنگ آکر کہا۔

"لیکن آواز تو اس کھنڈر سے بھی آئی تھی۔ آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے
کہ تمام کھنڈروں سے آواز آئے۔" فاروق بولا۔

"ڈریکولا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تو ذرا جلدی پوچھو، میں انتظار کرنے کا عادی نہیں۔" فاروق نے
مسکرا کر کہا۔

"یار تنگ نہ کرو، اچھا آؤ، پہلے اسی کھنڈر کو ٹھوک بجا کر دیکھ لیتے
ہیں۔" محمود نے کہا۔

"میرے پاس ٹھوک بجا کر دیکھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے پہلے کیوں
نہ بتایا، گھر سے کوئی ہاکی یا کرکٹ کا بلا ہی لے آتے۔" فاروق نے کہا۔

"ہم ہاتھوں سے کام لیں گے اور اگر تم ہاتھ پیر ہلانے کے لیے بالکل

تیار نہیں ہو تو ایک طرف کھڑے رہو۔"

یہ کہہ کر محمود نے واقعی کھنڈر کی دیواروں کو ٹھوکنا، بجانا شروع کر دیا،
فاروق سے رہا نہ گیا، وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ یہ دیکھ کر محمود مسکرایا۔

"آخر تم خود کو کام چور ثابت کرنے کے چکر میں کیوں رہتے ہو جب
کہ ہو نہیں۔"

"اس طرح میں شیخی بگھارنے سے بچ جاتا ہوں۔" فاروق نے کہا۔

اچانک انہوں نے اپنے پیچھے کھٹکے کی آواز سنی، دونوں چونک کر مڑے
لیکن دیر ہو چکی تھی، سروں پر پڑنے والی لکڑیاں ان کی آنکھوں میں تارے نچا
گئیں، پھر یہ تارے بھی ڈوب گئے اور ان کے ذہن اندھیروں میں ڈوب
گئے۔

☆☆☆

خون کا بنک

"اُف اللہ! یہ تو محمود اور فاروق ہیں۔" فرزانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں! دونوں بُری طرح زخمی بھی ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے فکر مند ہو کر کہا۔ پھر وہ جھکے اور فاروق کو اپنے کندھے پر ڈال کر کھنڈر سے نکل آئے۔ فرزانہ محمود کا وزن نہیں اٹھا سکی تھی، اس لیے وہ وہیں کھڑی رہی، انسپکٹر جمشید جلد ہی واپس آئے اور محمود کو اُٹھا لیا، اب فرزانہ بھی ان کے ساتھ جیپ تک آئی، انسپکٹر جمشید نے دونوں کو پچھلی سیٹوں پر لٹا دیا تھا۔

"تم ان کو سنبھالے رہنا، کہیں لڑھک نہ جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے، دوسرے ہی لمحے جیپ شہر کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

"ابا جان! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" فرزانہ نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"اللہ پر بھروسہ رکھو بیٹی! انہیں اس کے تعاقب میں اتنی دُور نہیں نکل جانا چاہیے تھا۔ ڈریکولا کوئی عام مجرم نہیں ہے اور نہ ہم اس سے عام مجرموں کی طرح مقابلہ کر سکتے ہیں، غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ انہیں تعاقب سے منع نہیں کیا،

خیر جو ہونا تھا، ہو گیا۔"

محمود اور فاروق کو ہسپتال پہنچا کر اور فرزانہ کو ان کے پاس چھوڑ کر وہ گھر آئے۔ اس وقت انہیں یاد آیا، بیگم کو بھی وہ بے ہوش چھوڑ کر ڈریکولا کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تھے۔ گھر پہنچے تو بیگم ہوش میں آ چکی تھیں، البتہ بیگم شیرازی ابھی تک گہری نیند میں تھیں۔

"کیا ہوا تھا بیگم۔" انہوں نے پوچھا۔

"اُف توبہ! میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوفناک آدمی کبھی نہیں دیکھا، پھر بھی میں اسے دیکھ کر بے ہوش نہیں ہوئی تھی، اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا، اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔" بیگم جمشید نے بتایا، پھر چونک کر بولیں:

"ارے فرزانہ کہاں ہے۔"

"فرزانہ، محمود اور فاروق کے پاس ہسپتال میں ہے۔"

"جی۔ ہسپتال میں؟" بیگم جمشید بوکھلا کر بولیں۔

"ہاں۔ وہ زخمی ہو گئے ہیں، لیکن فکر کی کوئی بات نہیں، ان کی حالت اچھی ہے اور میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔"

"اوہ!" وہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے منہ سے نکلا:

"میرے بچے!"

"کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو۔"

"جی ہاں! لیکن بیگم شیرازی کا کیا کریں، انہیں بھی تو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"انہیں بھی ساتھ لے چلتے ہیں، آخر یہ بھی تو بے ہوش ہیں۔"

انہوں نے بیگم شیرازی کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ بیگم جمشید ان کے پاس بیٹھ گئیں اور جیپ چل پڑی۔ ہسپتال پہنچنے میں انہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ بیگم جمشید، محمود اور فاروق کو دیکھ کر بھونچکا کر رہ گئیں، ان کے سر پر پٹیاں باندھی جا چکی تھیں اور وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔ ڈاکٹر کمرے میں موجود تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ابھی ان کے ہوش میں آنے میں دیر لگے گی، انسپکٹر جمشید نے بیگم شیرازی کو ساتھ والے کمرے میں داخل کرا دیا، تاکہ دیکھ بھال میں آسانی رہے۔

اور پھر ادھر دن نکلا، ادھر محمود ہوش میں آ گیا، اس کے چند منٹ بعد فاروق نے بھی آنکھیں کھول دیں، وہ مسکرانے لگے۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ حالات خطرے سے باہر ہیں۔ البتہ ابھی چند دن ہسپتال میں رہنا پڑے گا، دوسری طرف بیگم شیرازی ہوش میں آ چکی تھیں، ڈاکٹروں نے ان کے معائنے کے بعد خون کی زبردست کمی بتائی تھی اور جب ان کے خون کا گروپ دیکھا گیا تو ہسپتال کے بلڈ بنک میں ان کے نمبر کا خون نہ ملا ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان کے لیے خون بہت ضروری ہے۔

اچانک انسپکٹر جمشید کو یاد آیا۔ غلام جیلانی اپنے بیٹے کو ڈاکٹر انصاری کے پاس لے گیا تھا اور اس نے کسی پرائیوٹ بلڈ بنک سے خون منگوایا تھا، انہوں نے فرزانہ کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر انصاری کی کلینک کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن ابھی تو دن نکلا تھا، ڈاکٹر انصاری وہاں کہاں تھا، البتہ ایک چوکیدار ضرور موجود تھا۔ انہوں نے اس سے ڈاکٹر کے گھر کا پتا معلوم اور وہاں پہنچ گئے۔ گھنٹی کا بٹن دبانے پر ایک ملازم نے دروازہ کھولا:

"ہمیں ڈاکٹر انصاری صاحب سے ملنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اتنے سویرے.... وہ تو ابھی سو رہے ہیں۔"

"ان سے ملاقات بہت ضروری ہے، ایک مریض کی زندگی کا سوال ہے، تم انہیں جگا دو۔"

"لیکن ان کی ہدایت ہے، سوتے میں انہیں جگایا ہرگز نہ جائے۔"

"تم فکر نہ کرو، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں جناب! میں یہ نہیں کر سکتا، ایک دن اسی طرح کسی کے مجبور کرنے پر میں نے جگا دیا تھا، انہوں نے میری پندرہ دن کی تنخواہ کاٹ لی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اگر انہوں نے تمہاری تنخواہ کاٹی تو میں تمہیں دوگنا تنخواہ جیب سے ادا کر دوں گا اور اگر ملازمت سے نکالا تو اس سے بہتر ملازمت دلوا دوں گا، بے فکر ہو کر جاؤ۔"

"یہ بات ہے تو میں ضرور جاؤں گا، کیونکہ میں خود اس ملازمت کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور اندر چلا گیا۔ وہ انہیں دروازے پر ہی چھوڑ گیا تھا۔

"عجیب ڈاکٹر ہے، یہ شاندار کوٹھی بتا رہی ہے کہ بہت مال دار ہے، لیکن اپنے ملازموں کی تنخواہیں کاٹ لیتا ہے۔"

"ایسے لوگ اسی طرح مال دار بنتے ہیں۔ غلام جیلانی نے بتایا تھا کہ اس نے بہت بھاری فیس وصول کی تھی۔"

"اور ہاں سب سے پہلے ڈریکولا کا خیال پیش کرنے والا بھی یہی ڈاکٹر ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" انسپکٹر جمشید نے اسے چونک کر دیکھا۔

"یہ کہ کہیں یہی شخص تو ڈریکولا نہیں۔"

"ارے نہیں! یہ تو بہت پرانا اور مشہور ڈاکٹر ہے۔ کم از کم اپنے پیشے کے اعتبار سے یہ بہت قابل آدمی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا، ملازم چلا آرہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ تھا۔

"مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے جناب!" اس نے آتے ہی کہا۔

"بہت خوب، تم فکر نہ کرو، اور اس جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤ، اب اس ڈاکٹر کے بچے سے مل کر ہی جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید کو بھی غصہ آ گیا۔

انہوں نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ روک لیا اور پھر ہٹانے کی کوشش نہ کی گھنٹی بدستور بجتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک نوجوان لڑکا آتا نظر آیا، وہ آنکھیں ملتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہا تھا، چہرے پر ناگواری تھی۔

"کیا بات جناب! آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"ہم ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہیں، اور ملے بغیر ہرگز نہیں جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ ابھی آرام کر رہے ہیں، دو گھنٹے بعد کلینک میں ملیں گے۔" اس نے کہا۔

"تم ان کے بیٹے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ بولا۔

"تو پھر اپنے ابا جان سے جا کر کہہ دو، دروازے پر کھڑا ہوا شخص ان سے ملے بغیر نہیں جائے گا، چاہے کچھ ہو جائے۔" یہ کہتے وقت ان کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ فرزانہ کپکپا اُٹھی۔ وہ ان کے اس روپ سے اچھی طرح

واقف تھی۔ عام طور پر بہت ہی بُرے مجرموں پر انہیں اس قدر غصہ آتا تھا، لیکن آج یہ غصہ شہر کے سب سے مشہور ڈاکٹر پر آیا تھا۔

لڑکا خاموشی سے واپس چلا گیا۔ وہ انتظار کرنے لگے اور جب ایک منٹ گزرنے پر بھی کوئی اندر سے نہ آیا تو انہوں نے پھر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

اس بار وہی لڑکا پھر نمودار ہوا اور تلملا کر بولا:

"آئیے جناب! ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔"

"شکریہ!" انسپکٹر جمشید منہ بنا کر کہا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے انہیں پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر انہوں نے دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سُنی۔ شاید کوئی اور ملاقاتی آ گیا تھا، اور پھر انہوں نے بھاری قدموں کی آواز سُنی۔ فوراً ہی کمرے میں کچھ پولیس والے داخل ہوئے۔ سب سے آگے ڈاکٹر انصاری تھا جو سب انسپکٹر کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ اس کے پیچھے تین کانسٹیبل تھے:

"یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے بے آرام کیا ہے، میرے ملازم نے اسے بتا دیا تھا کہ میں سو رہا ہوں تو جگایا جانا پسند نہیں کرتا، اس کے باوجود اس نے ملازم کو جگانے کے لیے کہا، میں نے اسے تو اسی وقت نوکری سے نکال دیا، کیونکہ اس نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر گھنٹی بجائی تو میرے لڑکے نے اسے بتایا کہ میں دو گھنٹے بعد کلینک میں مل سکتا ہوں، یہ اس پر بھی باز نہیں آیا اور گھنٹی بجاتا چلا گیا۔ آخر مجھے آپ کو فون کرنا پڑا، اسے گرفتار کر لیجیے۔ میں چاہتا ہوں، اس پر اتنا مضبوط مقدمہ بناؤ کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی یاد رکھیں کہ کسی کو بے آرام کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

ڈاکٹر رحمان انصاری کہتا چلا جا رہا تھا، دوسری طرف بے انسپکٹر مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا، وہ انسپکٹر جمشید کو بخوبی جانتا تھا۔ آخر ڈاکٹر کے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے جناب! میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی، کیا یہ کوئی بہت اہم آدمی ہے، اگر یہ بات ہے تو میں آپ کو بتا دوں، میں بھی کوئی کم اہم آدمی نہیں ہوں، میرے تعلقات بھی بڑے بڑے لوگوں سے ہیں، اگر آپ نے اسے گرفتار نہ کیا تو میں ڈی آئی جی صاحب کو فون کروں گا۔"

"ڈی آئی جی صاحب بھی ان کی گرفتاری کا حکم جاری نہیں کریں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا اس شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ یہ جس شہری کی بھی چاہے، نیند حرام کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر انصاری نے تلملا کر کہا۔

"جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، انہوں نے اگر آپ کو بے آرام کیا ہے تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہو گی۔"

"آخر یہ کون ہے؟" ڈاکٹر انصاری چیخ کر بولا۔

"میں ان کی اجازت کے بغیر آپ کو نہیں بتا سکتا۔" سب انسپکٹر نے کہا اور انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرائے اور پھر بولے۔

"ایک ڈاکٹر کا فرض دوسروں کی جانیں بچانا ہے، لیکن اگر وہ اپنے آرام کو زیادہ اہمیت دینے لگے تو پھر وہ دوسروں کی جانیں نہیں بچا سکتا، اس طرح ڈاکٹر انصاری خود اپنے پیشے کے مجرم ہیں اور انہیں اپنی سزا خود تجویز کر لینی چاہیے، مجھے اتنے صبح سویرے یہاں اس لیے آنا پڑا ایک مریضہ کی جان

خطرے میں ہے، اس کے جسم میں سے خون نہ جانے کہاں چلا گیا ہے، یہ کل اس قسم کا ایک کیس دیکھ چکے ہیں، انہوں نے اس مریض کے لیے خون کے ایک پرائیوٹ بنک سے خون کا بندوبست کیا تھا، میں ان سے صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ اس بنک کا پتا کیا ہے تاکہ وہاں سے مریضہ کے لیے خون حاصل کیا جا سکے، مریضہ سرکاری ہسپتال میں ہے اور اس کے نمبر کا خون بنک میں نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید رُکے بغیر کہتے چلے گئے، سب انسپکٹر اور ڈاکٹر انصاری خاموش کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے رُک کر انہوں نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! اب آپ فوری طور پر اس بنک کا پتا بتا دیں، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مریضہ کی حالت خراب ہو جائے۔ بعد میں آپ ڈی آئی جی صاحب کو فون کرتے رہیے گا اور جو بھی قانونی کاروائی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، میرا نام اور پتا یہ آپ کا بتا دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

"آخر آپ کون ہیں۔" ڈاکٹر نے تھکے تھکے انداز میں کہا، لہجے میں حیرت بھی تھی۔

"اگر آپ میرا نام جانے بغیر بنک کا پتا نہیں بتانا چاہتے تو سن لیں، مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔"

"اوہ! ڈاکٹر انصاری دھک سے رہ گیا، پھر اس کے ہونٹ اس طرح کھلے جیسے خواب میں بول رہا ہو:

"خون کا وہ بنک نیازی روڈ پر واقع ہے، اس سڑک پر سب سے اونچی عمارت۔"

''بہت بہت شکریہ! اب ہم چلیں گے.... اگر آپ اس معاملے کو آگے بڑھانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں یا ڈی آئی جی صاحب سے بات کریں، لیکن آج کے بعد آپ اپنے کسی ملازم کو یہ ہدایت نہیں کریں گے کہ کسی ملاقاتی کے آنے پر آپ کو جگایا نہ جائے۔''

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید تیزی سے مُڑے دروازے کی طرف چل پڑے، فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

سب انسپکٹر، کانسٹیبل اور ڈاکٹر انصاری پتھر کے بتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

☆☆☆

خون کے قطرے

انسپکٹر جمشید اور فرزانہ نیازی روڈ پر پہنچے۔ انہیں بلڈ بنک تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ بنک کھل چکا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو کاؤنٹر پر ایک لمبا چوڑا نوجوان نظر آیا۔ اس نے فوراً کہا:

''جی فرمایئے!''

''ہمیں ڈاکٹر انصاری نے بھیجا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے اور فرزانہ نے انہیں چونک کر دیکھا۔ دوسری طرف کاؤنٹر کلرک کے منہ سے نکلا:

''اوہ! تب تو آپ سیدھے اندر چلے جایئے اور فاضلی صاحب سے مل لیں، آپ کا کام وہی بتا سکیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ! سیدھے جا کر کس طرف مُڑنا ہے۔''

''دائیں ہاتھ آخری کمرہ ہے۔'' اس نے کہا۔

اور دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے۔ فرزانہ نے سرگوشی کی:

''ابا جان! یہ کیا معاملہ ہے۔''

''میں اندازہ لگا چکا ہوں۔ ڈاکٹر انصاری کے اس بنک سے کچھ خاص تعلقات ہیں، اسی لیے میں نے ڈاکٹر انصاری کا نام لے دیا تھا، لیکن مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ اس کا نام لینے کے بعد ہمیں خاص اہمیت دی جائے گی، خیر آؤ

دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور برآمدے کا موڑ مڑ گئے، آخر میں ایک کمرہ نظر آیا۔ دروازے پر چک پڑی تھی۔

انہوں نے چک اٹھائی اور اندر داخل ہو گئے۔ دن کے نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ سورج کی خوش گوار دھوپ پھیل چکی تھی اور اس کمرے میں دھوپ اس کھڑکی کی وجہ سے داخل نہیں ہو رہی تھی جس میں اندھے شیشے لگے ہوئے تھے، انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کیونکہ سردیوں کے موسم میں ایسا کون شخص ہوگا جو دھوپ کا راستہ روکے گا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک میز اور ایک کرسی بچھی تھی، میز کے دوسری طرف دروازے کے نزدیک تین کرسیاں اور موجود تھیں۔ سامنے والی کرسی پر ایک لمبے قد کا آدمی بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں پر چک دار شیشوں والی عینک تھی۔ ان شیشوں میں سے اس کی آنکھیں اگرچہ نظر آ رہی تھیں، لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔ اس نے دونوں کو گھور کر دیکھا اور بولا:

''تو آپ کو انصاری نے بھیجا ہے۔''

''جی ہاں! ہمیں او نمبر خون چاہیے۔''

''مل جائے گا، ڈاکٹر انصاری ہمارے بہت اچھے دوست ہیں اور ان کے بھیجے ہوئے گاہکوں کو ہم ہر حالت میں خون مہیا کرتے ہیں۔ آپ کو کتنی بوتلوں کی ضرورت ہے۔''

''کم از کم چار بوتلیں!'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''چار بوتلوں کی قیمت بارہ ہزار روپے ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''اوہ! اس قدر زیادہ قیمت!'' انسپکٹر جمشید چونکے۔

''لوگ اپنا خون سستا تو نہیں بیچتے، ضرورت مند اگر خون بیچنے پر مجبور

ہو جاتے ہیں تو منہ مانگی قیمت ضرور وصول کرتے ہیں۔''

''خیر، چار بوتلیں پیک کرا دیں۔ میں بارہ ہزار روپے کا چیک لکھ دیتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''چیک مجھے دے دیں اور بوتلیں کاؤنٹر سے لے لیں۔''

''بہت بہتر!'' انہوں نے کہا اور جیب سے چیک بک نکال کر چیک لکھنے لگے، تھوڑی دیر بعد وہ مکان سے باہر نکل رہے تھے اور ایک پلاسٹک کی ٹوکری میں چار بوتلیں انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں لٹک رہی تھیں۔

''اس مکان کے اندر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوتا رہا ہے۔'' فرزانہ پریشان ہو کر بولی۔

''شاید اس لیے کہ یہ خون کی دکان ہے، کسی عام چیز کی نہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اوہ! ہم طاہر جیلانی کے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنا تو بھول ہی گئے، نہ جانے وہاں کیا حالات پیش آئے ہوں گے۔''

''خون ڈاکٹروں کے حوالے کرنے کے بعد معلوم کریں گے۔'' انہوں نے کہا۔

ہسپتال پہنچ کر انہوں نے غلام جیلانی کے ہاں فون کیا تو ادھر سے خان رحمان نے بتایا!

''ڈریکولا مکان کے اندر گھس آیا تھا، محمود اور فاروق اس وقت باہر جائزہ لینے گئے ہوئے تھے، نہ جانے ڈریکولا کی آنکھوں میں کیا تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا، گھر کے دوسرے لوگوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رات مکان کے اندر گولی بھی چلائی گئی تھی، یہاں خون کے قطرے بھی پڑے ملے ہیں، میں

نے تمہیں ہر جگہ فون کیا، لیکن کہیں نہ مل سکے، اس لیے مجبور ہو کر پولیس اسٹیشن کو فون کرنا پڑا۔''

''کیا وہ لوگ آگئے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''ہاں!'' انہوں نے کہا۔

''تو انہیں میری طرف سے کہہ دو، خون کا تجزیہ ضرور کرایا جائے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ خون کسی انسان کا ہے یا مُردے کا۔''

''بہت بہتر! لیکن تم کہاں تھے، محمود اور فاروق کا کوئی پتا چلا یا نہیں۔

اس پر انہوں نے اپنے ان دونوں کے بارے میں بتایا، پھر سلسلہ بند کر کے فرزانہ کی طرف مُڑے:

''اس کا مطلب ہے، ڈریکولا واقعی ایک سے زائد ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''ہاں! میرا پہلے ہی یہی خیال تھا۔''

''اور مزے کی بات یہ کہ کم از کم دو ڈریکولا زخمی ہو چکے ہیں، ان کا خون راستے میں گرتا چلا گیا ہوگا اور ان کھنڈرات میں بھی قطرے موجود ہوں گے، یہ قطرے ہمیں ان کے ٹھکانے تک لے جا سکتے ہیں۔''

''بہت خوب! ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے، کہیں خون کے قطرے مٹا دیے جائیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''لیکن پہلے محمود اور فاروق کو تو دیکھ لیں۔''

''ہاں! یہ بھی ضروری کام ہے۔'' انہوں نے چونک کر کہا اور ان کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

یہاں بیگم جمشید کے علاوہ پروفیسر داؤد اور شائستہ بھی موجود تھے۔

''ارے! آپ کو کس طرح خبر ہو گئی۔''

''میں نے اور شائستہ نے آج ناشتا تمہارے ساتھ کرنے کا پروگرام بنایا تھا، گھر گئے تو تم وہاں نہیں تھے، بیگم شیرازی سے معلوم کرنا چاہا تو وہ بھی وہاں نہیں تھیں۔ لیکن تمہارے گھر میں خون کے قطرے ضرور موجود تھے، ہم سمجھ گئے، رات کوئی حادثہ ہو گیا ہے، اس لیے سیدھے یہاں چلے آئے۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''بہت خوب! آپ تو جاسوس بنتے جا رہے ہیں انکل۔'' فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

''شاید یہ تمہاری صحبت کا اثر ہے، ورنہ ایک سائنس دان کا جاسوسی سے کیا تعلق۔''

''لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خون ان کا نہیں، ایک ڈریکولا کا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''کیا مطلب؟'' پروفیسر داؤد زور سے چونکے۔

انہوں نے تفصیل سے ساری بات دہرا دی۔ اتنے میں خان رحمان بھی وہاں آگئے۔ اب سب نے مل کر کھنڈرات کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا، وہ دروازے کی طرف مُڑے ہی تھے کہ ایک آواز نے ان کے قدم روک لیے!

''آپ اتنی آسانی سے کھنڈارت میں نہیں جا سکیں گے۔''

وہ چونک کر مڑے، فاروق شوخ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''تو پھر کتنی آسانی سے جا سکیں گے۔'' فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

''ہمیں ساتھ لے جانا ہوگا۔'' محمود بولا۔

''چل بھی سکو گے۔'' فرزانہ بولی۔

''چوٹ ہمارے سروں پر آئی ہے، نہ کہ پیروں میں۔'' فاروق بولا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحبان نے تمہیں چلنے پھرنے سے روک دیا ہے۔''

''ڈاکٹروں کو کیا معلوم، ہم کتنے مضبوط ادارے کے مالک ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''اچھا تو پھر ہم پہلے ڈاکٹر صاحبان سے اجازت لے لیں۔''

''ہاں ضرور! وہ آ کر ہمارا معائنہ کر سکتے ہیں، ہم انہیں بالکل ٹھیک نظر آئیں گے۔'' فاروق بولا۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحبان کو آنا پڑا، دونوں کا معائنہ کرنے کے بعد وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ آخر انہیں یہ کہنا پڑا۔

''یہ دونوں چلنے پھرنے کے قابل ہیں، حالانکہ ہمارا خیال تھا، ابھی اس حالت تک پہنچنے میں انہیں ایک ہفتہ لگے گا۔''

''یہ ہمارے ادارے کی طاقت کا کمال ہے۔'' فاروق بولا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کھنڈرات کی طرف روانہ ہو گئے۔ خان رحمان، پروفیسر داؤد اور شائستہ بھی ان کے ساتھ تھے، اچانک ایک جگہ انسپکٹر جمشید نے اپنی جیپ روک لی۔ پروفیسر داؤد کو بھی کار روکنا پڑا۔ ابھی شہری حدود سے نہیں نکلے تھے۔

''کیا بات ہے ابا جان!'' فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں ایک کام بھول گیا، اکرام کو کچھ ہدایات دینی ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ جیپ سے نیچے اتر آئے۔ سامنے ہی ایک انگریزی ادویات کی دکان تھی، انہوں نے وہاں سے اکرام کو فون کیا اور واپس جیپ میں

آ بیٹھے۔

آپ نے انکل اکرام کو کیا ہدایات دی ہیں۔'' فرزانہ نے پوچھا۔

''بیگم شیرازی اور تمہاری امی ہسپتال میں تنہا رہ گئی ہیں، ان کی حفاظت کا انتظام کرنا ضروری تھا، ادھر غلام جیلانی کے بیٹے کی حفاظت کے لیے بھی کچھ کرنا ضروری تھا، لہذا میں نے اکرام کو ہدایات دی ہیں کہ طاہر جیلانی کو بھی ہسپتال پہنچا دے ان تینوں کو ایک کمرے میں رکھا جائے اور اس کمرے کو پولیس کے گھیرے میں دے دیا جائے، اندر خود اکرام موجود رہے، اس کے ہاتھ میں پستول ہو اور انگلی ٹریگر پر، ڈریکولا کے بارے میں بھی میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے، یہ بھی کہ وہ اسے کس طرح بھگا سکتا ہے، انہوں نے بتایا۔''

''آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے ہم رات سے پہلے ہسپتال واپس نہیں لوٹیں گے۔'' محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ان کھنڈرات میں خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''لیکن سننے میں تو یہ آیا ہے کہ ڈریکولا جیسے لوگ دن کے وقت اپنی قبروں سے نہیں نکلتے۔'' فاروق نے کہا۔

''ہاں! اس کے باوجود وہاں خطرہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''خیر! دیکھا جائے گا۔'' محمود نے کندھے اچکائے۔

ان کی جیپ اور پروفیسر داؤد کی کار آگے پیچھے چلتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئیں۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج خوب چمک رہا تھا۔ کھنڈرات کا سلسلہ شروع ہوتے ہی انسپکٹر جمشید نے جیپ روک دی۔ کار بھی رک گئی، پھر سب نیچے اتر آئے۔

''پروفیسر صاحب! آپ کا ڈریکولا اور اس کی کہانیوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ صرف کہانیاں ہیں۔'' پروفیسر داؤد فوراً بولے۔

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن اب تو میں ایک عدد ڈریکولا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اور ہم بھی دیکھ چکے ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''اگر ایسا ہے، تو یہ میرے لیے اس صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔'' انہوں نے کہا، پھر چونک کر بولے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چند آدمیوں نے ڈریکولا کا روپ دھار لیا ہو۔''

''لیکن وہ اُڑنے کے سے انداز اور رفتار سے کس طرح دوڑ سکتے ہیں۔'' محمود نے اعتراض کیا۔

''اور انسان کا خون کس طرح پی سکتے ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ میری لائن کی چیز نہیں ہے۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''تو کیا یہ ہماری لائن کی چیز ہے۔'' خان رحمان فوراً بولے۔

''شاید یہ ہم میں سے کسی کی لائن کی بھی چیز نہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

پھر سب آگے بڑھے۔ سب سے پہلے ان کے سامنے وہی کھنڈر آیا جس میں محمود اور فاروق بے ہوش ملے تھے:

''اوہو.... ہم تو یہاں کسی خیال کے تحت آئے تھے، شاید بھی بھول گئے۔'' فرزانہ چونک کر بولی۔

''ارے ہاں! ہمیں تو خون کے قطرے تلاش کرنے ہیں۔''

''واقعی باتوں میں اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ تو ایسا کرتے ہیں، سب کے سب الگ الگ سمتوں میں خون کے قطرے تلاش کرتے ہیں، اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔

خون کے قطروں کی تلاش شروع ہوئی.... دُور دُور تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی زمانے میں یہاں اچھی خاصی آبادی رہی ہو۔ جو شاندار قسم کی عمارات میں رہتی تھی، بعض کھنڈر تو اب تک اچھی حالت میں تھے۔ ان میں سے چند ایک گنبد نما بھی تھے اور ایک گنبد نما عمارت کے کھنڈر کے سامنے فاروق چلّا اٹھا:

''ابا جان ذرا اِدھر آیئے۔!''

وہ سب فاروق کی طرف لپکے.... وہ جھکا ہوا تھا۔ نزدیک پہنچنے پر انہوں نے دیکھا، اس جگہ خون کے کچھ قطرے موجود تھے اور ان کا سلسلہ ایک سمت میں چلا گیا تھا، یہ جگہ سڑک کے کنارے تھی اور زخمی ڈریکولا شاید اسی جگہ سڑک سے کھنڈرات میں داخل ہوا تھا۔ البتہ سڑک پر انہیں خون کے قطرے نظر نہ آئے۔

''سڑک پر گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں، ان کے ٹائروں نے خون کے قطرے مٹا دیے ہوں گے۔'' خان رحمان نے خیال ظاہر کیا۔

''تب بھی ان کے نشانات سڑک پر ہونے تو چاہئیں تھے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ہو سکتا ہے، ڈریکولا کو کوئی کار مل گئی ہو یا اس نے اپنی کار کہیں چھپا

رکھی ہو اور وہ اس میں بیٹھ کر یہاں تک آیا ہو۔'' فاروق نے خیال ظاہر کیا۔
انسپکٹر جمشید اس کی بات سن کر مسکرائے اور بولے:

''تو پھر کار یہاں موجود ہونی چاہیے تھی۔''

''اوہ!'' ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''یہاں ایک بہت ضروری مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس نقطے کے سمجھ میں آجانے سے ہی یہ کیس حل ہو گا، اگر ڈریکولا یا دونوں زخمی ہونے والے ڈریکولا کے پاس کار تھی تو سڑک پر سے کار کون لے گیا۔'' انسپکٹر جمشید پُر جوش انداز میں بولے۔

''ٹھہرئیے ابا جان! ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈریکولا ہوا میں اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا، وہ لمبی لمبی چھلانگیں لگا رہا تھا اور اس کے پاؤں کبھی کبھی ہی سڑک پر لگتے نظر آتے تھے۔ ان حالات میں ہو سکتا ہے خون کافی دُور دُور گرا ہو۔'' فرزانہ نے نیا خیال ظاہر کیا۔

اس پر انسپکٹر جمشید نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ان کھنڈرات میں ان کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں انہیں دیکھا، کیوں کہ فرزانہ کی بات سُن کر کسی اور کو تو ہنسی تک نہیں آئی تھی اور وہ قہقہہ لگا رہے تھے۔

''خیر تو ہے ابا جان! آپ نے فرزانہ کی بات پر قہقہہ لگایا ہے یا کوئی اور بات ہے، کہیں ڈریکولا کا بھوت تو آپ سے نہیں چمٹ گیا۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا:

''نہیں! فرزانہ کی بات ہی اتنی مزے دار تھی کہ میں ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن اس کی یہ بات ہمیں کیوں مزے دار نہیں لگی۔'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی دوسری طرف فرزانہ بھی حیران کھڑی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔

''دیکھو نا.... اگر ڈریکولا تقریباً ہوا میں بھی اُڑ رہا تھا تو اس کا خون تو مسلسل بہہ رہا تھا، خون تو سڑک پر برابر گرتے رہنا چاہیے تھا، ہوا میں اُڑنے کی صورت میں قطروں کا درمیانی فاصلہ تھوڑا بہت ہی زیادہ ہو سکتا ہے۔'' لمبی چھلانگوں کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

''واقعی آپ کی بات ٹھیک ہے، تو کیوں نہ ہم پہلے سڑک پر شہر کی طرف چل کر دیکھیں، خون کے قطرے یہاں سے کتنے فاصلے پر ملتے ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''بالکل ٹھیک! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

''تو پھر چلو!'' پروفیسر داؤد بولے۔

وہ سب سڑک پر چلنے لگے، انہوں نے نظریں سڑک سے چپکا دیں۔ سڑک پر خون کا ننھا سا قطرہ بھی ان کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن تقریباً ایک فرلانگ تک چلتے رہنے کے بعد بھی انہیں خون کا کوئی قطرہ نظر نہیں آیا۔ اب تو اُن کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔

''کم از کم اس کی چھلانگیں اتنی لمبی نہیں تھیں۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔ کھنڈرات میں ہم دیکھ چکے ہیں، خون کے قطروں کی ایک قطار سی آگے چلی گئی ہے۔''

''ہوں! پھر تو وہی نقطہ دوبارہ پیدا ہو گیا۔'' فاروق کے منہ سے نکلا۔

''ہاں! ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ سڑک پر خون کے قطرے کیوں نہیں ہیں اور اب ہم واپس اسی جگہ چلیں گے جہاں سے سڑک پر چلنا شروع کیا تھا۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ واپس اس جگہ پہنچے اور پھر دھک سے رہ گئے۔ انہوں نے پہلے زمین کو اور پھر ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

خون کے قطرے غائب ہو چکے تھے اور دور دور تک کوئی قطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈریکولا کا بھائی

''یا اللہ رحم! یہ کیا ماجرا ہے۔'' خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔'' فاروق نے کہا اور جملہ درمیان میں چھوڑ دیا۔

''کیا کہا تھا۔'' فرزانہ اس کی طرف جھلا کر پلٹی۔

''یہی کہ ہمارا واسطہ ڈریکولا سے نہیں، ڈریکولا کے بھوت سے ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور اگر یہ ڈریکولا ہے تو پھر بہت عقل مند ڈریکولا ہے، جس نے ہمیں آتے دیکھ کر خون کے قطرے مٹا دیے۔'' محمود نے کہا۔

''سوال تو یہ ہے کہ اس نے قطرے کس طرح مٹا دیے، یہاں تو کھرچنے کے نشان بھی نہیں ہیں۔'' خان رحمان بولے۔

''یہ کچھ مشکل نہیں، سپرٹ یا پیٹرول جیسی چیزوں سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، کیا تم لوگ ہوا میں بو محسوس نہیں کر رہے؟'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ہاں! بو تو محسوس ہو رہی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔ ''خیر، اگر قطرے مٹا دیے گئے ہیں تو کیا ہوا، ہمیں سمت تو معلوم ہو چکی ہے۔ آؤ اس طرف چلیں۔''

"ابا جان! کیا اس جگہ ہم خطرے میں نہیں ہیں، کیا خون کے قطرے صاف کرنے والا ہماری تاک میں نہیں ہوگا۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے، لیکن بھئی! ہم خطرے میں کب نہیں ہوتے، خطرات سے کھیلنا تو ہمارا مشغلہ بن چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے اور آگے بڑھنے لگے۔ وہ سب ان کے ساتھ قدم اُٹھانے لگے۔ دل دھک دھک کر رہے تھے۔

اب وہ صرف اندازے سے چل رہے تھے۔ خون کے قطرے نہ مٹا دیے گئے ہوتے تو نہایت آسانی سے اس جگہ پہنچ جاتے جہاں ڈریکولا گیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک ملبے کے ڈھیروں اور گری ہوئی دیواروں کو پھلانگتے آخر وہ ایک گنبد والی عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ اس کی سیڑھیاں ابھی تک سلامت تھیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ پورے علاقے پر ہو کا عالم طاری تھا اور سورج ان کے سروں پر چمک رہا تھا، اگرچہ موسم سرما تھا، تاہم اس وقت انہیں پسینہ آ گیا تھا۔ اب خدا جانے یہ پسینہ خوف سے آیا تھا یا بھاگ دوڑ سے۔

"کیا خیال ہے، اس عمارت کو اندر سے کیوں نہ دیکھا جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"دیکھو یار.... کہیں پھنس نہ جائیں۔" خان رحمان بولے۔

"اللہ مالک ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا، فوراً ہی وہ سب مارے خوف کے اچھل پڑے انسپکٹر جمشید کے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ایک ہولناک گڑگڑاہٹ ہوئی تھی، یوں جیسے پوری وادی میں زلزلہ آ گیا ہو۔ انسپکٹر جمشید بھی چونک کر پیچھے ہٹ آئے۔ گڑگڑاہٹ فوراً رک گئی۔

"میرا خیال ہے، جمشید اندر نہ جاؤ۔" خان رحمان نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اندر جائے بغیر کام کیسے چلے گا۔" وہ بولے۔

"کہیں یہ واقعی روحوں کا معاملہ نہ ہو، جیسا کہ فرانس میں سننے میں آتا ہے۔"

"میرا ان باتوں پر ایمان نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پھر بھی.... کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم شہر جا کر پوری تیاری کر کے آئیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"پوری تیاری سے آپ کی کیا مراد ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"یہی کہ ہم لکڑی کی میخیں تیار کرا لائیں۔ ہو سکتا ہے، اندر ہمارا واسطہ ڈریکولوں سے پڑ جائے، لکڑی کی میخوں کے بغیر ہم انہیں ٹھکانے نہیں لگا سکیں گے۔ اب ہم ان کا ٹھکانا دیکھ ہی چکے ہیں اور وہ یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتیں۔" پروفیسر داؤد کہتے چلے گئے۔

"اگر آپ سب کی مرضی یہی ہے تو واپس چلے چلتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مجبور ہو کر کہا، ورنہ وہ تو اسی وقت اندر جانا چاہتے تھے۔

آخر وہ واپس ہوئے۔ راستے میں انہوں نے ایک اخبار فروش لڑکے سے اخبار خریدا.... کیونکہ وہ تو صبح سویرے ہی اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے تھے اور ابھی تک اخبار نہیں پڑھ سکے تھے۔ پہلے ہی صفحے نے ان کا سکون درہم برہم کر دیا.... سُرخی یہ تھی:

"شہر کے پانچ دولت مند آدمیوں کا خون غائب ہو گیا۔"

نیچے تفصیل درج تھی۔ یہ وارداتیں ایک دن پہلے کی تھیں۔ اس رات

دو واقعات تو ان کے سامنے ہی ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بھی یقیناً ہوئے
ہوں گے، جن کے بارے میں انہیں کل ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ اخبار میں ڈریکولا
کے امکان پر بھی بات کی گئی تھی اور ڈریکولا کے بارے میں پوری تفصیل سے
لکھا گیا تھا لوگوں کو اس سے بچنے کی ترکیبیں بھی لکھ دی گئی تھیں۔

اب شہر میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ ڈریکولا
ایک سے زائد ہیں، یعنی دو یا تین ہوں گے، لیکن اخبار پڑھنے کے بعد یہ کہنا
پڑتا ہے کہ ان کی تعداد تقریباً پانچ تو ضرور ہے اور ہمیں جلد از جلد اس گنبد والی
عمارت پر حملہ کر دینا چاہیے۔'' انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

''حیرت ہے، یہ اتنے ڈریکولا ہمارے شہر میں کہاں سے آ گئے۔''
فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''اور وہ بھی یکا یک ... ابھی کل ہی تو پہلی مرتبہ یہ چیز سامنے آئی
ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ہوں، پروفیسر صاحب، کیوں نہ اس گنبد والی عمارت کو ٹینک کے
ذریعے روند ڈالا جائے۔'' خان رحمان نے نئی ترکیب سوچی۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ڈریکولا اپنے جسموں سے ضرور ہاتھ دھو
بیٹھیں گے، لیکن وہ اپنی روحیں دوسرے جسموں میں داخل کر لیں گے، انہیں
مارنے کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ دن کے وقت سو رہے
ہوں تو ان کے سینوں میں عین دل کے مقام پر لکڑی کی میخیں ٹھوک دی جائیں
۔ بس وہ ختم ہو جائیں گے۔'' پروفیسر نے بتایا۔

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں، لیکن ابھی تک میرا ذہن یہ بات ماننے پر تیار
نہیں کہ دنیا میں واقعی ڈریکولا کا وجود ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے، میں نے تو جو کچھ ڈریکولا کی کہانیوں میں پڑھا
ہے، وہی بتایا ہے۔'' پروفیسر بولے۔

وہ گھر پہنچے، سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے اکرام کو فون کیا۔ اس نے
بتایا کہ ہسپتال میں خیریت ہے۔ انہوں نے اسے ہدایت دیں اور رات کے
وقت خاص طور پر ہوشیار رہنے کے لیے کہا۔ پھر وہ لکڑ میخیں تیار کرنے میں
مصروف ہو گئے۔ اس کام کے لیے وہ کسی بڑھئی کی مدد بھی لے سکتے تھے، لیکن
انسپکٹر جمشید نے اسے مناسب نہ سمجھا۔

انہیں یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ دوپہر پہلے وہ ایک بار پھر اس
عمارت تک پہنچ جانا چاہتے تھے مگر میخیں تیار کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے
انہیں دی ہو گئی اور ابھی انہیں دیر ہو گئی اور ابھی انہیں ہسپتال بھی جانا تھا، وہاں
بیگم شیرازی اور طاہر جیلانی کے پاس کچھ بیٹھنے کے بعد وہ باہر نکلے تو سورج
مغرب میں جھک گیا تھا۔

''میرا خیال ہے، اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' پروفیسر بولے۔

''ابھی تو سورج غروب ہونے میں دیر ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ہاں! لیکن اس وقت تک وہ اپنی نیند پوری کر چکے ہیں اور ہم ان تک
پہنچیں گے تو وہ جاگ جائیں گے، جب کہ ہم سوتے میں ان کے سینوں میں
میخیں ٹھوکنا چاہتے ہیں۔''

''کمال ہے، ہم تو اس طرح باتیں کر رہے ہیں، جیسے سچ مچ کے
ڈریکولوں سے واسطہ آ پڑا ہو۔ اور جیسے وہ سب کہانیاں بالکل سچ ہیں جو ہم نے
پڑھی ہیں۔'' فاروق نے ہنس کر کہا۔

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے، بات دراصل کیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے

اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی شہر کو الو بنا رہا ہے۔''

''شہر کو الو .... تمہارا مطلب ہے کوئی شخص پورے شہر کو الو بنا رہا ہے۔'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں! اور شہر میں ہم بھی رہتے ہیں۔'' فاروق مسکرایا۔

''یار کچھ تو خیال کرو، ہمارے ساتھ پروفیسر انکل اور انکل خان رحمان بھی ہیں۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔

''خیر خیر .... تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''فاروق! تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

''یہی کہ یہ سب کسی نے چکر چلایا ہے۔ اس نے کہا۔

''تھوڑی دیر کے لیے تمہاری بات مان لیتے ہیں، اب تم یہ بتاؤ کہ طاہر جیلانی اور بیگم شیرازی کا خون کہاں چلا گیا .... شہر کے پانچ دولت مند آدمیوں کا خون کس طرح غائب ہو گیا۔'' انہوں نے پوچھا۔

''میں ابھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، تاہم گنبد والی عمارت کا جائزہ لینے کے بعد کچھ کہہ سکوں گا۔'' فاروق نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''ہاں! ورنہ تمہیں بہت دکھ ہوتا کہ تمہاری بجائے میں نے کیوں جواب دے دیا۔'' فاروق جل بھن کر بولا۔

''اچھا تو پھر کیا طے رہا، کل صبح کھنڈرات کا رخ کریں گے۔''

''انسپکٹر جمشید نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کل ہی ٹھیک رہے گا۔

''اس کا مطلب ہے، آج رات ہمیں ہسپتال میں گزارنا ہو گی۔'' محمود کے منہ سے نکلا۔

''ہاں! ہو سکتا ہے، ڈریکولا کا کوئی بھائی طاہر جیلانی یا بیگم شیرازی کا خون چوسنے آئے۔'' فاروق نے مسکرا کر کہا۔

''ڈریکولا کا بھائی۔ بھئی واہ۔ یہ بھی خوب رہی۔'' خان رحمان ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

''وہ رات انہوں نے ہسپتال میں جاگ کر گزاری، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ طاہر جیلانی اور بیگم شیرازی کی حالت بہت بہتر تھی، چنانچہ وہ سورج نکلتے ہی کھنڈرات کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی اس مہم کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اخبار ضرور دیکھ لیا تھا اور شہر میں جگہ جگہ ڈریکولا کے حملوں کی خبریں پڑھنے میں آئی تھیں۔ پورا شہر خوف کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ حکام نے اخبارات اور ویڈیو کے ذریعے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگوانے کا مشورہ دیا تھا۔ اور رات کے وقت گھروں میں آگ جلائے رکھنے اور بلب روشن رکھنے کی ہدایات شائع ہوئی تھیں۔ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ جلائی ہوئی لکڑی سے اگر ڈریکولہ پر حملہ کیا جائے تو وہ بھاگ جاتا ہے اس کے علاوہ محکمہ پولیس کے اعلیٰ حکام نے فرانس کے حکام سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ تاکہ وہاں سے کسی ماہر کو بلوایا جا سکے جو ڈریکولوں کا مقابلہ کرنے کا کام انجام دے سکے۔

''ایسے میں کسی کو انسپکٹر جمشید کا خیال تک نہ آیا، کیونکہ کوئی یہ سوچ ہی نہ

سکا کہ وہ بھی ڈریکولا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے محکمے کے تمام لوگ بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ انسپکٹر جمشید کہاں اور کس حال میں ہیں اور وہ ان کھنڈرات کی طرف بڑھ رہے تھے.... اپنی پوری پارٹی کے ساتھ۔ اکرام کی ڈیوٹی آج بھی ہسپتال میں ہی تھی۔

ان کی جیپ پچھلی سیٹ پر لکڑی کی لمبی لمبی میخیں رکھی تھیں اور لوہے کے دو ہتھوڑے بھی، محمود، فاروق اور فرزانہ بار بار مڑ مڑ کر ان ہتھیاروں کو دیکھ رہے تھے۔ آج تک کسی دشمن کا مقابلہ انہوں نے اس قسم کے ہتھیاروں سے نہیں کیا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ کھنڈرات سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆

سڑک کے کنارے انہوں نے جیپ اور کار روک دی اور نیچے اُتر آئے۔ لکڑی کی میخیں ہاتھوں میں تھام کر اور ہتھوڑے پکڑ کر وہ اس گنبد والی عمارت کی طرف بڑھے۔ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ میں پستول بھی تھام رکھا تھا۔

''آج کا معرکہ فیصلہ کن ہوگا، ہم کامیاب لوٹیں گے، ورنہ یہیں ختم ہو جائیں گے، کیونکہ ناکام لوٹنے کی صورت میں یہ لوگ ہمارے شہر پر چھا جائیں گے اور جینا حرام کر دیں گے انسپکٹر جمشید بولے۔

''ٹھیک ہے ابا جان! آج ہم ان ڈریکولا کے بچوں کو ناکوں چنے چبوا دیں گے۔'' فاروق نے کہا اور اس کے جملے پر انہیں ہنسی آ گئی۔ ڈور ڈور تک ان کے علاوہ وہاں اور کوئی نہ تھا۔

بس ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ستون اور ملبے کے ڈھیر ہی ڈھیر تھے، ان ڈھیروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ برابر اس عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے.... اور آخر اس کے سامنے پہنچ گئے:

''کیا تم لوگ تیار ہو؟'' انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

''جی ہاں! ہم تیار ہیں۔'' محمود نے کہا۔

''تم میں سے ہر ایک، ایک ایک میخ تھام لے، ہتھوڑوں کا کام اینٹوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، خان رحمان اور پروفیسر داؤد کے پاس ہتھوڑے موجود تھے، اس لیے محمود فاروق اور فرزانہ نے اینٹیں اٹھا لیں۔ شائستہ کو تو ہسپتال میں ہی چھوڑ آئے تھے اور اس نے آنے کے لیے ضد بھی نہیں کی تھی۔

جونہی انسپکٹر جمشید نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، ہولناک گڑگڑاہٹ ہوئی، اگر کوئی اور ہوتا تو شاید چیخیں مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا، لیکن انہوں نے پروانہ کی اور ان کے پیچھے دوسرے بھی چڑھتے چلے گئے۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ آواز بھی شروع ہو گئی جو نہ کسی درندے کی تھی اور نہ انسان کی، البتہ بہت خوف ناک تھی جیسے کچھ لوگوں کا گلا کاٹا جا رہا ہو اور خرخراہٹ کی بے شمار آوازیں مل جل کر آ رہی ہوں۔ ایک بار تو ان کے دل دہل گئے۔ اگر انسپکٹر جمشید ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ بھاگ ہی کھڑے ہوتے، لیکن انسپکٹر جمشید تو بدستور آگے بڑھ رہے تھے اور انہیں چھوڑ کر وہ کیسے بھاگ سکتے تھے۔

سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد ایک دروازہ تھا، وہ اس دروازے میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے برآمدہ آ گیا اور برآمدے میں دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ۔ دروازہ کھلا تھا.... وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گئے اور پھر دھک سے رہ گئے، اندر پانچ تابوت رکھے تھے ان کے دروازے بند تھے، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، تو کیا ڈریکولا کی کہانیاں سچ ہی ہیں۔

تابوت کے نزدیک پہنچتے ہی عمارت میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے اور اس خاموشی میں وہ دلوں کی دھڑکنیں صاف سن سکتے تھے۔

''ہم بیک وقت خطرہ مول نہیں لیں گے، پہلے صرف ایک تابوت کھول کر دیکھیں گے اور اگر ہمیں اس میں کوئی مردہ لیٹا نظر آیا تو اس کے دل میں لکڑی کی میخ ٹھوک دیں گے۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔ وہ اس وقت بہت حیران تھے، تابوتوں کو دیکھ کر ان کے سب خیالات غلط ثابت ہو رہے تھے۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ واقعی ڈریکولاؤں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے تابوت کا ڈھکنا اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے ان سب کی چیخیں نکل گئیں..... لیکن انسپکٹر جمشید کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکلی تھی، البتہ دم بخود وہ بھی رہ گئے تھے۔

اندر ڈریکولا سے ملتی جلتی شکل کا ایک آدمی لیٹا تھا، اس کے وہ نوکیلے دانت باہر نکلے ہوئے تھے، ہونٹ تازہ خون سے تر تھے۔ آنکھیں کھلی تھیں، جن میں بلا کی چمک تھی، یہ چمک انتہائی خوفناک تھی۔ دونوں آنکھیں انہیں بُری طرح گھورتی معلوم ہوئیں۔

''رحمان جلدی کرو، میخ اس کے دل میں اتار دو۔'' پروفیسر داؤد چلائے۔

''خان رحمان نے تھرتھر کانپتے ہاتھوں سے لکڑی کی میخ اس کے دل کے مقام پر رکھ دی۔ اور پروفیسر داؤد نے ہتھوڑا میخ کے سر پر پوری قوت سے دے مارا۔ فوراً ہی ایک بھیانک چیخ عمارت میں گونجی اور خون اس کے سینے

سے فوارے کی مانند اُبل پڑا۔ انہیں اس کی آنکھیں باہر کو اُبلتی معلوم ہوئیں۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید نے یہ منظر بغور دیکھا، انہوں نے اس کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اتنی دیر میں خان رحمان اور پروفیسر داؤد دوسرے تابوت کی طرف بڑھ چکے تھے۔ وہ جلد از جلد اس کام سے فارغ ہو جانا چاہتے تھے جیسے انہیں کسی نظر نہ آنے والے دشمن کی تلاش ہو۔ اسی وقت دوسری چیخ گونجی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد نے دوسرے ڈریکولا کے ساتھ بھی وہی سلوک کر ڈالا ہے۔

وہ اس کارروائی کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو..... نہ جانے یکا یک انہیں کیا ہو گیا تھا۔ ادھر خان رحمان اور پروفیسر داؤد تیسرے ڈریکولا کے بعد چوتھے کا رُخ کر رہے تھے۔ اور اس وقت فرزانہ نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا جو ان میں رونما ہوئی تھی۔ وہ ان کے قریب کھسک آئی اور سرگوشی میں بولی:

''ابا جان! خیر تو ہے، آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں! میں پریشان ہوں۔'' انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''آخر کیوں..... بات کیا ہے، کیا یہ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا۔''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' انہوں نے عجیب لہجے میں کہا۔

''بات کوئی ضرور ہے اور آپ چھپا رہے ہیں۔'' فرزانہ بولی۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی ہماری ان حرکات پر خوب قہقہے لگا رہا ہو، جسے ہم کامیابی سمجھ رہے ہیں، دراصل یہ ہماری

ناکامی ہو۔"

"بظاہر تو ایسا نظر نہیں آتا۔" فرزانہ نے کہا۔

"خیر.... پانچوں چیخ بلند ہونے دو، پھر دیکھیں گے۔" انہوں نے کہا اور پھر خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ اب پانچویں تابوت کی طرف بڑھ رہے تھے، اور پھر فضا میں پانچویں چیخ بھی گونج اٹھی۔ خان رحمان خوشی سے اچھل پڑے:

"وہ مارا! ہم نے اس مصیبت کا خاتمہ کر دیا۔ اب کسی کے جسم کا خون غائب نہیں ہوگا۔" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

"بالکل ٹھیک، اور اب ہم شہر چلیں گے، شہر والوں کو یہ خوش خبری سنائیں گے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"مگر ابا جان کیوں خاموش ہیں۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر چلو.... واپس چلیں، خان رحمان نے کہا۔

"ہاں! چلو۔" پروفیسر داؤد بولے۔

وہ عمارت کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھے.... اچانک انہیں محسوس ہوا، انسپکٹر جمشید ان کے ساتھ قدم نہیں اٹھا رہے ہیں وہ چونک کر مڑے

"کیا بات ہے ابا جان! کیا آپ نہیں چلیں گے۔"

"ہوں، چلو چل رہا ہوں۔" انہوں نے اس طرح کہا جیسے اب تک سوتے رہے ہوں۔ اور قدم اٹھانے لگے۔

"وہ ان سب سے پیچھے چلنے لگے۔ پستول اب تک ان کے ہاتھ میں

تھا۔ سب سے آگے خان رحمان تھے، وہی دروازے تک پہنچے، اور پھر چونک اٹھے۔ دروازہ بند تھا جب کہ اندر داخل ہوتے وقت انہوں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

"ارے! دروازہ کس نے بند کیا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"شش.... شاید .... کسی بھوت نے شرارت کی ہو۔" فاروق ہکلایا۔

خان رحمان نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خان رحمان کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے پورا زور لگا ڈالا، لیکن دروازہ نہ کھلا۔ اب تو ان سب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چہروں پر ہوائیاں دوڑ گئیں۔

"یہ.... یہ کیا چکر ہے۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

"مم.... میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ڈریکولا نہیں، ڈریکولا کا بھوت ہے، آخر پھنس گئے نہ بھوت کے چکر میں۔" فاروق نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"جمشید! تم کیوں خاموش ہو، کچھ بولتے کیوں نہیں۔"

"کیا بولوں.... مجھے کافی دیر پہلے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم اس عمارت میں قید کر لیے گئے ہیں۔" انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تو بتایا کیوں نہیں تھا۔" پروفیسر داؤد جھلا کر بولے۔

"جب مجھے یہ احساس ہوا، ہم اندر آ چکے تھے اور باہر نکلنے کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔"

"آخر دروازہ کس نے بند کیا۔ ڈریکولا تو سارے اندر موجود ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

''یہ ڈریکولا نہیں، ان کے مجسمے ہیں۔''

''مجسمے!!!''

ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ آنکھیں مارے حیرت اور خوف کے پھیلتی چلی گئیں۔

☆☆☆

قید اور انجام

''کیا کہا، تم نے مجسمے!!'' پروفیسر داؤد بُری طرح چیخے۔

''ہاں! مجسمے .... آپ مجسموں کے سینوں میں میخیں گاڑتے رہے ہیں۔''

''شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ کیا تم نے ان کے سینوں سے خون اُبلتے نہیں دیکھا۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ہاں! دیکھا ہے۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ یہ مجسمے ہیں۔''

''آخر کیسے؟''

''انہیں چھو کر دیکھ لیں، یہ پلاسٹک کے مجسمے ہیں، گوشت پوست کا ان سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، ہمیں نہایت خوبصورتی سے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ اسی لیے خون کے قطرے ملا دیے گئے تھے تا کہ ہم شک میں پڑ جائیں اور اس طرف چلے آئیں۔ دراصل ان واقعات کے پیچھے کسی بہت ہی چالاک ذہن کا ہاتھ ہے۔''

''اور اس ذہن کا مقصد کیا ہے، ظاہر ہے کہ خون واقعی جسموں سے نکالا گیا ہے۔''

''ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن خیر، تفصیل بعد میں بتاؤں گا، پہلے تو

یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ پلاسٹک ہی کے ہیں یا نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ تابوتوں کی طرف پلٹے۔ ان کے ڈھکنے ابھی تک کھلے پڑے تھے۔ انہوں نے پہلے ڈریکولا کے جسم کو چھو کر دیکھا اور پھر انہیں بھی چھونے کی دعوت دی۔ چند لمحے بعد ہی انہیں یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ وہ واقعی پلاسٹک کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔

''اُف میرے اللہ! یہ کیا چکر ہے، اگر یہ پلاسٹک کے ہیں تو ان میں خون کہاں سے آ گیا۔''

''پلاسٹک کی ہی تھیلیوں میں خون بھر کر اگر ان مجسموں میں رکھ دیا جائے اور لکڑی کی میخوں سے ان میں سوراخ کر دیا جائے تو خون باہر نکلے گا، کیونکہ پلاسٹک ٹھوس حالت میں استعمال کیا گیا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''لیکن آخر ایسا کیوں کیا گیا ہے۔''

''صرف اس لیے، اگر کوئی ادھر آ ہی نکلے تو اسے یہ یقین کر لینا پڑے کہ ان کا واسطہ واقعی ڈریکولا سے ہے۔''

''تب تو ہم یہ یقین کر سکتے تھے، پھر ہمیں یہاں سے نکل کیوں نہیں جانے دیا گیا۔'' پروفیسر داؤد نے اعتراض کیا۔

''اس لیے کہ مجھے پہچان لیا گیا ہے اور مجرم مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، وہ جانتا ہے، میں اس کی بنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں کروں گا۔ اس لیے دروازہ بند کر دیا گیا ہے، ہمارے علاوہ یہاں جو کوئی بھی آئے گا، اوّل تو سیڑھیوں پر سے ہی خوف زدہ ہو کر واپس چلا جائے گا، ورنہ ان تابوتوں کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد تو کسی کو شک رہ ہی نہیں جائے گا اور شہر میں یہ خبر آناً فاناً میں مشہور ہو جائے گی کہ یہاں واقعی ڈریکولا آ بسے ہیں۔''

''تو آخر حقیقت کیا ہے۔'' خان رحمان چلائے۔

''حقیقت تمہارے سامنے ہے، یہ سب نقلی ڈریکولا ہیں، مجرم ڈریکولا کے روپ میں لوگوں کے جسموں سے خون نچوڑ لیتے ہیں اور پھر ضرورت مند لوگوں کو مہنگے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔''

''اوہ.... تت.... تو .... کیا....'' فرزانہ ہکلائی، اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

''ہاں! تم ٹھیک سمجھیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''تو کیا تم مجرم کو جان چکے ہو۔'' خان رحمان نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''اگر میں پہچان نہ گیا ہوتا تو اس وقت اس عمارت کا دروازہ بند نہ کر دیا جاتا۔'' انہوں نے کہا۔

''اوہ! اب ہم کیسے نکلیں گے یہاں سے۔''

''خدا ہم پر مہربان ہے، ہم لوہے کے ہتھوڑے ساتھ لے کر آئے ہیں، ان سے دیوار توڑی جا سکتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

لیکن فوراً ہی ان کی مسکراہٹ بجھ گئی۔'' انہوں نے ناک سکوڑی، پھر گھبرا کر بولے۔

''اوہ! یہ گیس....''

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ فوراً ہی وہ تڑ سے گرے اور سب کے سب بے ہوش ہو گئے۔

ہوش آیا تو اسی عمارت میں تھے اور رسیوں سے جکڑے پڑے تھے۔ انہوں نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا، کمرے میں ان کے علاوہ تین آدمی اور تھے جو تابوتوں کے اُوپر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر فرزانہ کی آنکھیں مارے حیرت

کے پھیل گئیں، البتہ انسپکٹر جمشید مسکراتے رہے۔

''میں پہلے ہی جان گیا تھا کہ ان واقعات کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''تم سمجھ گئے تھے، اسی لیے تو یہاں نظر آ رہے ہو، اب سنو! ہمارا پروگرام .... تمہیں ان تابوتوں میں بند کر دیا جائے گا۔ تمہارا لباس اور رنگ ڈھنگ ڈریکولا جیسے بنا دیے جائیں گے۔ تمہیں مکمل طور پر بے ہوش کر دیا جائے گا اور منہ پر ٹیپ چپکا دی جائے گی، کپڑوں کے اندر سے نائیلون کی رسیاں گزار کر تمہیں ان تابوتوں سے جکڑ دیا جائے گا۔ پھر ہم شہر میں خون چوسنے کی وارداتیں کریں گے اور جان بوجھ کر کچھ دلیر لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لائیں گے، وہ اس عمارت میں آئیں گے اور تابوتوں میں تمہیں بند دیکھ کر خیال کریں گے کہ ڈریکولا بند ہیں، چنانچہ وہ شہر جائیں گے اور لکڑی کی میخیں لے کر یہاں آ جائیں گے، پھر تمہارے سینوں میں وہ میخیں گاڑ دیں گے، کہو کیسی رہے گی۔''

''بہت اچھی رہے گی۔'' فاروق نے ہنس کر کہا۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ ان کا پروگرام سن کر کانپ گیا تھا۔

''ابا جان! آخر یہ کون لوگ ہیں۔'' محمود نے پوچھا۔

''ارے ہاں! اس کیس کے دوران تمہیں ان سے ملنے کا تو اتفاق ہی نہیں ہوا.... سنو.... یہ تین ہیں، ان میں سے دو ڈریکولا کے بھیس میں خون حاصل کرتے ہیں، طریقہ یہ ہے کہ گیس کے ذریعے اپنے شکار کو بے ہوش کر دیتے ہیں اور پھر سرنج کے ذریعے شہ رگ سے خون نکال لیتے ہیں، اگر کوئی ان کا تعاقب کرتا ہے تو کھنڈرات کی طرف آنے والی سڑک پر دوڑ پڑتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جوتوں میں ایک خاص قسم کی ربڑ لگوا رکھی ہے، یہ ربڑ انہیں اوپر اچھال دیتی

ہے اور یہ اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر کوئی تعاقب کرتا ہے تو تیسرا ساتھی کار لے کر سڑک پر موجود رہتا ہے اور ان دونوں کو کار میں لے کر ہوا ہو جاتا ہے، کار میں ہی یہ ڈریکولا کے لباس سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں.... ان کا پیچھا کرنے والے کھنڈرات تک پہنچ جاتے ہیں، یہ بھی آگے جا کر کھنڈرات میں داخل ہو جاتے ہیں، یہاں انہوں نے ٹیپ ریکارڈ اور لاؤڈ سپیکر فٹ کر رکھے ہیں، ان پر یہ وہ عجیب اور خوفناک آواز نشر کرتے ہیں، اور اس طرح تعاقب کرنے والے خوفزدہ ہو جاتے ہیں، اس عمارت کی سیڑھیوں کے نیچے گڑگڑاہٹ پیدا کرنے کے لیے ایک مشین لگا رکھی ہے، اب میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ یہ ہیں کون.... ان میں سے ایک تو ڈاکٹر انصاری ہے، دوسرا خون کے بنک کا فاضلی اور تیسرا فاضلی کا ساتھی، جو بنک کے باہر کاؤنٹر پر موجود رہتا ہے۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے شک کیسے ہوا، بیگم شیرازی کے گھر میں ملنے والا شیشے کا وہ ٹکڑا تو تمہیں یاد ہوگا، جس پر خون بھی لگا ہوا تھا۔ اس روز دراصل اتفاق سے سرنج ڈاکٹر انصاری کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھی، خون کے نشانات تو اس نے سپرٹ وغیرہ سے صاف کر دیے لیکن وہ ٹکڑا اس کی نظروں میں آنے سے رہ گیا.... یہیں سے میں نے اصل معاملے کو تاڑنا شروع کیا تھا۔ پھر سڑک کے کنارے خون کے دھبے ملے تھے، لیکن سڑک پر نہیں تھے، ہم نے ایک ڈیڑھ فرلانگ تک سڑک کا جائزہ بھی لے ڈالا تھا لیکن دھبے نہیں ملے، اس لیے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ یہاں تک کار پر آئے تھے، کار موجود نہیں تھی، بس میں سمجھ گیا کہ ان کی تعداد ایک سے زائد ہے اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں.... تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے یہ سب باتیں کیسے جان لیں تو سنو، فرانس اگرچہ اس قسم کے واقعات کا گڑھ سمجھا جاتا ہے، لیکن دراصل وہاں بھی ایسے ہی فرضی ڈریکولا ملتے ہیں، جنہوں نے کہانیوں کی وجہ سے یہ روپ

دھار کر خون جمع کرنے کا کاروبار کر رکھا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہاں کچھ لوگ واقعی خون چوسنے لگ گئے ہوں، لیکن بدروحوں کا کوئی وجود نہیں، میں نے فرانس میں موجود اپنے ایک دوست سے ایک بار ان واقعات کی حقیقت معلوم کی تھی تو اس نے مجھے جواب میں اسی کی تفصیل لکھی تھی۔ اور یہی تفصیل ان دو دنوں میں میرے کام آئی۔"

انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے اور سب راز ان پر کھلتے چلے گئے۔

"تو پھر آپ نے یہاں پھنسنا کیوں منظور کیا۔" محمود نے سوال کیا۔

"اس کے بغیر یہ لوگ سامنے نہیں آسکتے تھے، جب انہوں نے وہ گیس چھوڑی اور سب بے ہوش گرے، اس وقت بھی میں بے ہوش نہیں ہوا تھا اور جب یہ لوگ مجھے باندھ رہے تھے تو میں نے اپنے جسم کو پھلا لیا تھا، چنانچہ اب میں نے اپنے جسم سے زائد ہوا نکال دی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رسیاں ڈھیلی ہو گئی ہیں اور میں ان میں سے ہاتھ نکال سکتا ہوں، نہ صرف یہ کہ ہاتھ نکال سکتا ہوں، اپنی خفیہ جیب سے پستول بھی نکال سکتا ہوں جو میں ایسے ہی موقعے کے لیے چھپا لایا تھا۔ اگر تم لوگوں کو یقین نہیں تو یہ دیکھ لو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کا پستول والا ہاتھ سامنے آگیا اور تینوں مجرم دھک سے رہ گئے اور ان سب کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔

"ارے! یہ تو دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ گئی۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ ابا جان ان سے بھی بڑے ڈریکولا ہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہائیں! تم ابا جان کو ڈریکولا بنا رہی ہو۔ جب کہ انہوں نے ڈریکولاؤں کو آدمیوں میں بدل دیا۔" محمود نے بھی شوخ لہجے میں کہا۔

"شکر کرو کہ وہ تمہیں ڈریکولا نہیں بنا رہی۔" فاروق بولا اور سب ہنسنے لگے۔

انسپکٹر جمشید خود کو رسیوں سے آزاد کرتے جا رہے تھے اور ان کے پستول کی نالی بدستور ان تینوں کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔